مارکسزم اور مسئلہ قومیت

استالین

مترجمہ

ل۔ احمد

منظر رضوی

قومی دار الاشاعت بمبئی ۴

راج بھون، سینڈھرسٹ روڈ

جملہ حقوق محفوظ (یونیورسل الیکٹرک ٹھاکر دوار ۲۳۳ [illegible]) قیمت دو روپیہ

فہرست

دیباچہ ۵
مارکسیت اور قومی مسئلہ ۱۱
۱۔ قوم ۲۰
۲۔ قومی تحریک ۳۲
۳۔ مسئلہ کی نوعیت ۴۳
۴۔ قومی خود مختاری .. ۵۴
۵۔ روس میں قومی مسئلہ .. ۶۶
قومی مسئلے کے سلسلے میں پارٹی کے فوری فرائض ۷۶
۱۔ سرمایہ داری نظام اور قومی جبر و تشدد .. ۷
۲۔ سوویت نظام اور قومی آزادی .. ۸۱
۳۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے فوری فرائض .. ۸۷
قومی مسئلے کے متعلق پارٹی کے فوری فرائض پر رپورٹ ۹۴
بحث کا جواب ۱۰۶
سوویت جمہوریتوں کا اتحاد ۱۱۱
سوویت اشتراکی جمہوریتوں کے اتحاد کا اعلان ۱۱۵
مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کے سیاسی فرائض ۱۱۸
۱۔ مشرق کی سوویت جمہوریتوں کے سلسلے میں۔ ۱۲۰
۲۔ مشرق کے محکوم اور نیم محکوم ملکوں کے سلسلے میں ۱۲۱
قومی مسئلہ ۱۳۰
ضمیمہ ۱ قومی مسئلے پر پارٹی کی تجویز .. ۱۴
ضمیمہ ۲ پارٹی پروگرام سے ایک اقتباس ۱۴

دیباچہ

ہماری سیاسی زندگی میں قومی مسئلے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے سامنے آج جتنے اہم مسائل ہیں ان کا براہ راست اس مسئلہ سے تعلق ہے۔ چاہے اہل وطن کو بھوک اور فاقے کی موت سے بچانے کا سوال ہو یا جاپانیوں کے حملے سے وطن کی حفاظت کرنے کا سوال، اسے قومی حکومت کے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اور قومی اتحاد اور قومی حکومت کا دارومدار آج قومی مسئلے کو صحیح طریقے سے حل کرنے پر ہے۔

اس کتاب میں قومی مسئلے پر اسٹالین کے کچھ چیدہ مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ ان میں اسٹالین نے قومی مسئلے پر مارکس اور لینن کی تعلیم کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ ہندستان کی کمیونسٹ پارٹی نے قومی مسئلے کا جو حل محبان وطن کے سامنے رکھا ہے اس کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کے لئے ان مضامین کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

سب سے پہلا مضمون "مارکسیت اور قومی مسئلہ" ہے جسے اسٹالین نے ۱۹۱۳ء میں لکھا تھا۔ یہ مضمون بجائے خود ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کے سات حصے ہیں۔ یہاں اس کے پانچویں اور چھٹے حصے کو حذف کر دیا گیا ہے جن میں یہودی مزدور لیگ اور قفقازی سوشلسٹوں کی غلطیوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسئلے کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لئے بیشک

وہ بھی بے حد ضروری ہیں مگر ان کو حذف کرنے سے نفسِ موضوع پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

قومی مسئلے پر غور کرنے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوم کیا ہے؟ اسٹالین نے کہا کہ "قوم ایک مستقل ملت ہے جو تاریخی ارتقا کی بدولت پیدا ہوئی اور جس کی زبان، جس کا وطن اور جس کی اقتصادی زندگی ایک ہے۔ اور جو ایک مخصوص نفسیاتی ساخت رکھتی ہے جس کا اظہار اس کی مشترکہ تہذیب میں ہوتا ہے۔" قوم کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمیشہ سے چلی آئی ہو۔ وہ تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک خاص عہد یعنی سرمایہ داری کے عہد میں وجود میں آتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری نے صرف قوموں کو ہی پیدا نہیں کیا بلکہ کثیر الاقوام سلطنتوں میں قومی جبر و تشدد کی بنیاد بھی۔ مسئلہ کو حل کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ کامل جمہوریت قائم کی جائے اور تمام قوموں کو آزادی سے ترقی کرنے کا موقع دیا جائے اور کامل جمہوریت قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کی تمام قوموں کے محنت کش عوام ایک ہو کر جدوجہد کریں۔ لیکن شک و شبہ کی دیواریں مختلف قوموں کے محنت کش عوام کو ایک دوسرے سے الگ رکھتی ہیں۔ اس دیوار کو کیسے توڑا جا سکتا ہے؟ اسٹالین نے بتایا کہ اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ملک کی تمام قوموں کی برابری تسلیم کی جائے، ہر قوم کا حق خودارادیت اور اپنی علیحدہ آزاد ریاست بنانے کا حق مان لیا جائے۔ اور بلا لحاظ قومیت تمام محنت کشوں کو ان کی طبقاتی انجمنوں میں متحد کیا جائے۔ قوموں کے حق خودارادیت کے لئے جدوجہد کرنے سے مقصد قومی جبر و تشدد کی پالیسی کا خاتمہ کرنا اور اسے ناممکن بنا دینا ہے تاکہ قوموں کی باہمی دشمنی کی کوئی بنیاد باقی نہ رہے۔ اس دشمنی کی دھار کند ہو جائے۔" اور اسی لئے اسٹالین نے "قومی تہذیبی خودمختاری" کے مطالبے کی مخالفت کی۔ یہاں ہمیں قومی تہذیبی خودمختاری کو "قوموں کے حق خودارادیت" سے خلط ملط کر کے غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ خودارادیت کا اصول ہر قوم کو اس کے وطنی علاقے کی بنیاد پر مکمل آزادی عطا کرتا ہے۔ اس اصول کی بنیاد پر ایک علاقے کے تمام محنت کشوں کو ان کی طبقاتی انجمنوں میں متحد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن "قومی تہذیبی خودمختاری" کا مطالبہ علاقہ تو دور کی چیز ہے ہر کارخانے کے مزدوروں کو زبان اور تہذیب کی بنیاد پر الگ الگ کر دیتا ہے۔ اس سے تمام مزدور کمزور ہوتے ہیں۔ اس علاقے کے تمام محنت کشوں کی جدوجہد کمزور ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "تہذیبی خودمختاری" پا کر لوگ سیاسی معاملے میں خودارادیت یعنی حقیقی آزادی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے اسٹالین نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ قومی مسئلے کو حل کرنے کے لئے قوموں کے حق خودارادیت کو تسلیم کرنا جس قدر ضروری ہے اسی قدر یہ بھی ضروری ہے کہ تمام قوموں کے محنت کشوں کو ان کی طبقاتی انجمنوں، ان کی ٹریڈ یونین، ان کی کسان سبھا، ان کی مزدور پارٹی میں متحد کیا جائے۔ طبقاتی اداروں میں تمام قوموں کے محنت کشوں کو متحد کئے بغیر قوموں کا حق خودارادیت، قوموں کی آزادی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ زارشاہی کے جبر و تشدد کے زمانے میں قومی مسئلے کی یہ صورت تھی۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب کہ روس میں مزدور انقلاب کامیاب ہوا، زار کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، زار نے جن جن قوموں کو اپنا غلام بنایا تھا وہ آزاد ہو گئیں اور ہر جگہ وہاں کے محنت کش برسرِ اقتدار آ گئے۔ اسٹالین نے سنہ ۱۹۲۱ء میں روسی کمیونسٹ پارٹی کی دسویں کانگریس میں ایک مقالہ اور پھر ایک رپورٹ پیش کی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح مختلف قوموں کے مزدور طبقے حق خودارادیت سے کام لے کر الگ نہیں ہوتے بلکہ آزاد قوموں کا ایک گھرانا بناتے ہیں جس میں آگے بڑھی ہوئی قومیں، پچھڑی ہوئی قوموں کی مدد کرتی ہیں اور سب مل کر اشتراکیت کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔

اس کے بعد سوویت جمہوریتوں کے اتحاد پر اسٹالین کی رپورٹ ہے جو ۳۰ دسمبر ۱۹۲۲ء

کو سویتی اشتراکی جمہوریہ ہائے متحدہ کی پہلی کانگرس میں پیش کی گئی تھی۔ تمام خود مختار اور آزاد سوویت جمہوریتیں "ایک ہی ریاست، یعنی سویتی اشتراکی جمہوریہ ہائے متحدہ میں جو مستقبل کی عالمگیر سویتی جمہوریت کا نمونہ ہے، آکر مل رہی ہیں"۔ استالین نے کہا تھا "آج کا دن نئے روس کی فتح کا دن ہے۔ اس نئے روس کی جس نے قومی جبر و تشدد کی زنجیریں توڑ دی ہیں، جس نے سرمایہ داری کا سر کچل دیا اور مزدور طبقے کی آمریت قائم کی، جس نے مشرق کی قوموں کو بیدار کیا اور مغرب کے مزدوروں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا ہے۔"

پھر مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کے فرائض پر استالین کی تقریر ہے۔ اس تقریر کے پہلے حصے میں استالین نے قومی تہذیب اور "عالمگیر انسانی تہذیب جس کی طرف اشتراکیت بڑھتی جا رہی ہے" کے تعلق پر روشنی ڈالی ہے۔ "مزدور تہذیب قومی تہذیب کے منافی نہیں بلکہ وہ اس میں ایک نئی روح ڈالتی ہے۔ دوسری طرف قومی تہذیب مزدور تہذیب کو منسوخ نہیں بلکہ اس میں رنگ ابھرتی اور اسے اور بھی سرسبز و شاداب کرتی ہے۔" تقریر کے دوسرے حصے میں مشرق کے محکوم ملکوں میں قومی آزادی اور قومی اتحاد کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے۔ اسی تقریر میں استالین نے ہندستان کے متعلق وہ مشہور پیشین گوئی کی تھی جس کی تعبیر رفتہ رفتہ اب ملنے لگی ہے۔ استالین نے کہا تھا:

"آج کل ہندستان کا ذکر کچھ اس طرح کیا جاتا ہے گویا وہ ایک سالم چیز ہے۔ لیکن اس بارے میں شک نہیں کہ انقلابی اتھل پتھل کے دنوں میں ہندستان میں بہت سی قومیں جن کو لوگ ابھی جانتے تک نہیں اپنی اپنی زبان اور اپنی مخصوص تہذیب کے لئے اٹھ کھڑی ہوں گی۔"

سب سے آخر میں استالین کا مقالہ "قومی مسئلہ" ہے جس میں اس نے سامراج دشمن انقلاب کے عہد میں قومی مسئلے کے ایک نئے پہلو پر زور دیا ہے۔ قومی مسئلہ صرف مختلف قوموں کے سرمایہ داروں کی باہمی رقابت اور جھگڑوں کا ہی نتیجہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جیسے جیسے سرمایہ داری ترقی کرتی ہے اور مختلف قوموں کے سرمایہ داروں کی رقابتیں اور ان کے جھگڑے بڑھتے ہیں اسی رفتار سے قومی مسئلہ بھی زور پکڑتا ہے۔ لیکن یہ مسئلے کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا ایک دوسرا اور اس سے زیادہ اہم پہلو بھی ہے۔ قومی مسئلہ بڑی حد تک کسانوں کا، سامراج کے ستائے ہوئے بے شمار محنت کشوں کا مسئلہ ہے۔

سرمایہ داروں کی رقابت کے ساتھ ایک اور چیز بھی بڑھتی ہے اور وہ عام کسانوں کا قومی اور سامراج دشمن جذبہ ہے۔ اور اسی میں قومی مسئلے کو حل کرنے کا راز مضمر ہے۔ ان حالات میں یہ صرف ممکن ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو جاتا ہے کہ تمام قوموں کے عوام کا ایک متحدہ سامراج دشمن محاذ قائم کیا جائے اور یہ متحدہ محاذ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب تمام قوموں کی برابری اور ان کا حق خود ارادیت تسلیم کر لیا جائے۔

سامراجی سرمایہ دار قومی جبر و تشدد کی بنیاد ڈالتے ہیں اور قومی نفاق کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ محکوم ملکوں کے سرمایہ داروں پر اپنے اپنے نجی مفاد کی دھن سوار ہوتی ہے ہر ایک اپنی شرطوں پر اتحاد کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ڈھونڈنے پر بھی ان کو اتحاد کا راستہ نہیں ملتا۔ لیکن مزدور طبقہ اور مزدور طبقے کی کمیونسٹ پارٹی کا اپنا کوئی "نجی" مفاد نہیں۔ ان کا مفاد وہی ہے جو ساری قوم کا مفاد ہے۔ وہی پارٹی اس حقیقی اور پائیدار بنیاد کو لے کر آگے بڑھتی ہے جس پر ملک کی تمام قومیں اپنی آزادی کے لئے متحد ہو سکتی ہیں، اور آزاد اور مساوی حق رکھنے والی قوموں کی ایک ایسی دنیا آباد کر سکتی ہیں جس میں ہر قوم کو ترقی کرنے کی پوری

آزادی ہوگی اور وہ آپ اپنی قسمت بنا سکے گی۔ لیکن قوموں کی آزادی اور برابری کی تعبیر اسی وقت ملے گی جب سامراجیت دنیا سے بھسم ہو جائے اور ظلم و ستم کے اس محل کی اینٹ سے اینٹ بجنے لگے۔

جمہوریہ سویت کے مزدور طبقے نے آج سے بہت پہلے زار کی سامراجیت کا خاتمہ کر کے اپنے قومی مسئلے کو حل کر لیا۔ تاریخ نے آج ساری دنیا سے سامراجی نظام کو مٹا دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ آج جو عالمگیر جنگِ آزادی چھڑی ہوئی ہے اس کے ذمے یہی کام ہے۔ ہمیں بھی اس کام میں ہاتھ بٹانا ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ دنیا کی آزادی پسند قوموں کے ساتھ مل کر اپنے وطن کی حفاظت کرنے کے لئے قومی اتحاد قائم کریں اور اس کے لئے اپنے وطن کی تمام قوموں کا حق خود ارادیت تسلیم کریں۔ اسی طرح آج ہم اپنی آزادی کے لئے لڑ سکتے ہیں۔

آج ہماری اور ساری دنیا کی آزادی کی لڑائی ایک ہے۔ اور استالین ہم سب کی رہنمائی کر رہا ہے۔

شرف عالم

مارکسیت[1] اور قومی مسئلہ

یہ مضمون "مارکسیت اور قومی مسئلہ" ۱۹۱۲ء کے آخر اور ۱۹۱۳ء کے اوائل میں وائنا میں لکھا گیا تھا۔ پھر دوبارہ قومی مسئلہ پر استالین کے "مجموعہ مضامین" میں جمہوریہ سویت کی وزارت اقوام کی طرف سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے لئے مصنف نے ایک دیباچہ لکھا تھا جس میں یہ چند فقرے اس مضمون کے متعلق بھی تھے :۔

"یہ مضمون اس وقت لکھا گیا تھا جب روسی[2] سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اندر قومی مسئلے کے بنیادی اصولوں پر سخت اختلاف ہو گیا تھا۔ وہ سامراجی جنگ چھڑنے

۱ے مارکسیت یا جسے دوسرے لفظوں میں سائنسی یا علمی اشتراکیت بھی کہتے ہیں، جدید صنعتی مزدور طبقے کا نظریہ ہے۔ یہ مارکسیت کے نام سے مشہور ہے کیونکہ انیسویں صدی میں مزدور طبقے کے سب سے بڑے رہنما کارل مارکس اور اس کے دوست فریڈرک اینگلس کے ہاتھوں اس نظریہ کی داغ بیل پڑی تھی۔ پھر بیسویں صدی میں دنیا کے سب سے بڑے انقلابی لینن نے نئے حالات کے تحت اسے مزید ترقی دی۔ اور آج استالین اس پودے کو جو اب ایک ہرا بھرا پیڑ ہو گیا ہے پروان چڑھا رہا ہے۔ مارکسیت کا نظریہ تین حصوں یعنی جدلی مادیت، تاریخی مادیت اور قدر زائد کے نظریوں پر مشتمل ہے۔ مارکسیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نظریہ اور عمل کے اٹوٹ اتحاد پر مبنی ہے اور بقول فریڈرک اینگلس "یہ کوئی جامد اصول نہیں بلکہ ایسا راہنما ہے جس کی روشنی میں عمل کی راہ متعین ہوتی ہے۔"

۲ے روسی سوشل ڈیموکریٹک (یعنی اشتراکی جمہوری) مزدور پارٹی

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

سے ڈیڑھ سال پہلے کا زمانہ تھا جب کہ زمینداروں اور زار کی رجعت پسندی زوروں پر تھی اور سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب کی نشوونما ہو رہی تھی۔ اس وقت قوموں کے بارے میں دو مختلف نظریے اور اسی مناسبت سے دو قومی پروگرام بھی موجود تھے۔

(بسلسلہ صفحہ ۱۱) روس کے مزدور طبقے کی انقلابی جماعت تھی جو ۱۸۹۸ء میں قائم ہوئی۔ بانیوں میں لینن بھی تھا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں پارٹی کی دوسری کانگرس لندن میں ہوئی جس میں پارٹی کے دو حصے ہو گئے۔ ایک نے لینن کی رہنمائی قبول کی اور انقلابی اصولوں پر قائم رہا۔ دوسرا حصہ انقلاب کی دشواریوں سے گھبرا کر مصالحت پسندی کے گڑھے میں جا گرا۔ حتیٰ کہ جب انقلاب آیا تو اس نے انقلاب دشمنی کا جھنڈا اٹھایا۔ سنہ ۱۹۰۳ء کی لندن کانگرس میں لینن کے انقلابی پیرو اکثریت میں تھے اس لئے وہ بالشویک کہلائے۔ اور ان کے مخالفوں کو منشویک کہا گیا جس کے معنی ہیں اقلیت والا گروہ۔ جب منشویکوں کی انقلاب دشمنی نے زور پکڑا تو انہیں سنہ ۱۹۱۲ء میں روسی سوشل ڈیموکریٹک مزدور پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں لینن کی تجویز پر پارٹی کا نام بدل کر "روسی کمیونسٹ پارٹی" رکھ دیا گیا۔ پھر جب سنہ ۱۹۲۲ء میں نئے دستور کے مطابق آزاد جمہوریتوں کے آزادانہ اتحاد سے نئی وفاقی ریاست یعنی "سوویت اشتراکی جمہوریتوں کا اتحاد" قائم ہوا تو وہاں کی پارٹی بھی "روسی کمیونسٹ پارٹی" کے بجائے "سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی" ہو گئی۔ اور یہی اس کا موجودہ نام ہے۔

۳ہ سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب اس انقلاب کو کہتے ہیں جس کا مقصد جاگیرداری نظام، زمینداروں کے تسلط اور بادشاہت کو ختم کر کے سرمایہ دار طبقے کی ایک عوامی جمہوریت قائم کرنا ہو۔ جہاں کہیں جاگیری نظام اور زمینداری اور بادشاہت موجود ہوتی ہے وہاں مزدور طبقہ سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب کا علمبردار بن کر چلتا آتا ہے۔ لینن نے اپنی کتاب "دو داؤ پیچ" میں لکھا ہے کہ اگر اس وقت کوئی پوچھے کہ ہم سرمایہ دارانہ انقلاب کے بجائے فوراً اشتراکی مزدور انقلاب کا نعرہ کیوں نہیں بلند کرتے تو ہم جواب دیں گے کہ عوام الناس میں جمہوری رجحان تو ہے مگر وہ ابھی تک اشتراکیت سے ناواقف ہیں۔ ابھی طبقاتی (یعنی مزدور اور سرمایہ دار)

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

ایک آسٹریا والوں کا پروگرام تھا جسے بند اور منشویکوں کی حمایت حاصل تھی اور دوسرا روسی پروگرام یعنی بالشویکوں کا پروگرام تھا۔ اس مضمون میں پڑھنے والے کو دونوں رجحانوں کی تفصیل ملے گی۔ بعد کے واقعات خصوصاً سامراجی جنگ اور آسٹریا

(بسلسلہ صفحہ ۱۲) اختلافات زور پکڑنے نہیں پائے اور ابھی خود مزدور طبقہ منظم نہیں ہوا۔ روس بھر میں ہزاروں لاکھوں مزدوروں کی تنظیم کیجئے ...... آپ کو فوراً پتہ لگ جائے گا اتنے لوگوں کی تنظیم کرنے کے لئے ان کے اندر اشتراکیت کی روشنی پھیلانے کے لئے کہیں بڑے سے بڑے پیمانے پر جمہوری اصلاحات کی ضرورت ہے۔

۴ہ بند کا پورا نام "لتھوانیا، پولستان، اور روس کے یہودی مزدوروں کی انجمن" تھا۔ یہ انجمن سنہ ۱۸۹۷ء میں ولنا میں قائم ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں وہ روسی سوشل ڈیموکریٹک مزدور پارٹی کے قائم ہوتے ہی اس میں شامل ہو گئی۔ شروع میں بند کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ یہودی مزدوروں کو شہری حقوق میں برابری کا درجہ حاصل ہو۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں ر۔ س۔ ڈ۔ م۔ پارٹی کی دوسری کانگرس میں بند نے مطالبہ کیا کہ اسے یہودی مزدوروں کا واحد نمائندہ تسلیم کر لیا جائے۔ کانگرس کے انکار کرنے پر وہ پارٹی سے الگ ہو گئی۔ بند کے لوگ قومی تہذیبی خودمختاری کے علمبردار تھے جس کی بحث اس کتاب کے اصل متن میں ملے گی۔ عام مسائل پر وہ بالعموم منشویکوں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ روس کے اکتوبری یعنی مزدور انقلاب کے بعد بھی اس نے بالشویکوں کی مخالفت کی۔ مگر سنہ ۱۹۱۹ء سے بند پر انقلابی خیالات کا اثر پڑنے لگا اور اس کے اندر بھی ایک انقلاب پسند جماعت قائم ہو گئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء تک آتے آتے بند کی اکثریت کمیونسٹ ہو چکی تھی اور معدودے چند کو چھوڑ کر بند کے تمام ممبران روسی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔

۵ہ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے پہلے آسٹریا اصل میں "آسٹرو ہنگری شہنشاہیت" کی حیثیت رکھتا تھا جس میں آسٹریا کے علاوہ پولستان کا ایک حصہ، اور ہنگری اور کئی اور محکوم سلاف قومیں جیسے چیک،

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر متعدد قومی ریاستوں میں بٹ جانے سے یہ واضح ہو گیا کہ کون فریق حق پر تھا۔ اب کہ اسپرنگر اور باؤئر۶؎ کے قومی پروگرام کی دودھ کی گگری الٹ چکی ہے، اس میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ تاریخ نے آسٹروی مسلک کو ٹھکرا دیا ہے۔ بند کو بھی یہ ماننا پڑا کہ "قومی تہذیبی خود مختاری کا مطالبہ (یعنی آسٹریا والوں کا قومی پروگرام۔ سٹالن) جو سرمایہ داری نظام میں پیش کیا گیا تھا، اشتراکی انقلاب کے حالات میں بے معنی ہو جاتا ہے" (بند کی بارہویں کانگرس ۱۹۲۰ء)۔ لیکن بند کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس اعتراف سے اس نے (بلا ارادہ) یہ مان لیا کہ آسٹروی قومی پروگرام کے نظری اصول اور آسٹروی نظریہ قومیت کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔

روس میں جب انقلاب دشمنی۷؎ کا زور بڑھا تو وہ زیادہ اپنے ساتھ "کڑک اور گرج" ہی نہیں لایا۔ بلکہ اس کی وجہ سے لوگوں میں تحریک سے بد دلی اور مایوسی پھیل گئی اور اپنی مشترکہ قوتوں پر سے لوگوں کا بھروسہ اٹھنے لگا۔ جب تک لوگوں کو ایک روشن مستقبل پر یقین

(سلسلہ صفحہ ۱۳) سربی، کروٹ اور سلووین قومیں شامل تھیں۔ اس جنگ کے بعد شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔ ہنگری میں بالشویک حکومت قائم ہوئی جسے اتحادیوں نے دبا دیا اور سرمایہ داروں کی ایک جمہوریت قائم کی۔ آسٹریا، جرمنی اور روس کی شہنشاہیتوں سے پولستان کے منتشر حصوں کو ایک کر کے وہاں پولستانی زمینداروں اور سرمایہ داروں کی حکومت قائم کی گئی۔ چیکوسلوکیا میں ایک جمہوریت بنی۔ اور سرب، کروٹ اور سلووین قوموں کو ملا کر یوگوسلاویہ کی سلطنت یعنی ایک بادشاہت بنا دی گئی۔ اور اس طرح آسٹریا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

۶؎ اسپرنگر اور باؤئر، آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے دو رہنما تھے۔

۷؎ اس سے مراد وہ زمانہ ہے جب ۱۹۰۵ء کے انقلاب کو کچلنے کے بعد زار روس نے (باقی صفحہ ۱۵پر)

تھا وہ بلا امتیاز قومیت کندھے سے کندھا ملا کر جد و جہد کرتے رہے۔ مشترکہ مسائل سب کو اول اور مقدم تھے۔ لیکن جب دلوں میں شک نے جگہ بنا لی تو لوگ ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے، سب اپنے اپنے قومی خیمہ میں چلے گئے۔ نفسی نفسی کا شور مچ گیا۔ اور "قومی مسئلہ" سب سے اول اور مقدم ہو گیا!

انھیں دنوں میں ملک کی معاشی زندگی بھی ایک زبردست پلٹا کھا رہی تھی۔ ۱۹۰۵ء کا انقلابی سال کچھ یونہی نہیں گزر گیا تھا۔ دیہاتی علاقوں میں زرعی غلامی۸؎ کے باقی ماندہ اثرات پر ایک اور کاری ضرب پڑ چکی تھی۔ قحط سالی کے بعد فصلیں متواتر اچھی ہوئیں اور صنعتی گرم بازاری آئی جس سے سرمایہ داری کی ترقی کو بڑی مدد پہونچی۔ کسانوں میں بڑے چھوٹے کا امتیاز پیدا

(سلسلہ صفحہ ۱۴) سارے ملک میں مزدوروں اور کسانوں کی ہر انقلابی تحریک کو نہایت سختی سے پامال کرنے کی کوشش کی۔ پارٹی کو روپوش ہو جانا پڑا۔ مزدور سبھاؤں تک کو غیر قانونی قرار دیا جانے لگا۔ انقلاب دشمنی کا یہ زمانہ تقریباً ۱۹۱۱ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد مزدور تحریک نے پھر کروٹ بدلی جس کا پہلا اظہار یہ تھا کہ لینا کی سونے کی کان کے مزدوروں نے ہڑتال کی۔ اور جب وہاں مزدوروں پر گولی چلائی گئی تو سارے ملک میں ہلچل سی مچ گئی اور جگہ جگہ ہمدردی میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مزدور تحریک کا یہ نیا جوش و خروش آہستہ آہستہ بڑھتا گیا حتی کہ بالشویک پارٹی کی رہنمائی میں اس نے اکتوبر ۱۹۱۷ء میں مزدور انقلاب کی شکل اختیار کی۔

۸؎ زرعی غلامی، غلامی کی وہ صورت ہے جو سرمایہ داری سے پہلے جاگیرداری نظام کے تحت قریب قریب ساری دنیا میں رائج تھی۔ جاگیردار زمین کا مالک ہوا کرتا اور کسان ہمیشہ کے لئے زمین سے بندھے ہوتے تھے۔ وہ جس کھیت پر پیدا ہوتے اسی پر مرتے۔ زمین چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ نوکری اور پیشہ اختیار کر سکتے تھے۔ جاگیردار اگر زمین بیچتا یا خریدتا تو اس کے ساتھ گویا کسانوں کی خرید و فروخت (باقی صفحہ ۱۵پر)

ہونے لگا۔ شہروں کی آبادی بڑھی، تجارت کو فروغ ہوا اور آمدورفت اور باربرداری کے ذریعے تیزی سے بڑھے۔ سرحدی علاقوں میں ان حالات کا خاص اثر تھا۔ اور ان کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ روس کی قوموں کی معاشی مضبوطی کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس لئے ان کا تحریک میں پیچھے آنا لازمی تھا۔

اس زمانے میں جو آئینی حکومت[۹] قائم کی گئی تھی اس سے بھی روس کی قوموں میں اور زیادہ جنبش ہوئی۔ اخباروں اور کتابوں کی اشاعت بڑھ گئی تھی۔ پریس (مطابع) اور

(سلسلہ صفحہ ۸) بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ کسانوں پر طرح طرح کے ناقابل برداشت مظالم ہوا کرتے تھے۔ کسانوں کی بغاوتوں سے ڈر کے ۱۸۶۱ء میں زار نے روس میں قانوناً یہ طریقہ ختم کر کسانوں کو آزاد کر دیا۔ مگر یہ آزادی محض کہنے کی آزادی تھی۔ کسانوں پر مظالم جیوں کے تیوں ہوتے رہے۔ اور ۱۹۱۷ء کے مزدور انقلاب سے پہلے روس کے کسانوں کی مصیبت کا خاتمہ نہ ہو سکا۔

۹ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد زار روس نے اگر ایک طرف کسانوں اور مزدوروں کو بے رحمی سے کچلنے کی کوشش کی تو دوسری طرف سرمایہ داروں اور متوسط طبقے کے لوگوں کو کچھ معمولی سی اصلاحات دے کر خوش کرنے کی کوشش کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ روس میں پارلیمنٹ (جسے دوما کہتے تھے) قائم کی گئی۔ لیکن دوما کو قانون بنانے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ صرف سوال پوچھ سکتی اور مشورہ دے سکتی تھی۔ دوما کے انتخاب میں رائے دینے کا حق بہت محدود لوگوں کو دیا گیا تھا تاکہ صرف زمینداروں، سرمایہ داروں اور متوسط طبقے کے لوگ اس میں منتخب ہو سکیں۔ لیکن اس پر بھی جب دوما میں لوگ زار کی حسب مرضی منتخب نہیں ہوئے تو اس نے دوبارہ دوما کو برخواست کر دیا اور حق رائے دہی کو اور زیادہ محدود کر کے نئے سرے سے انتخاب کرایا۔ اسی کو زار کے بدخواہ "آئینی حکومت" کہا کرتے تھے۔

تہذیبی اداروں کو کسی قدر آزادی مل چکی تھی۔ قومی تھیٹروں کی تعداد میں اضافہ ہوا تھا۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ ان سب باتوں سے "قومی جذبات" کو تقویت ہوئی۔ دوما اور اس کے انتخابوں اور سیاسی جماعتوں نے قوموں کے لئے مزید سرگرمی کے مواقع فراہم کئے اور ان کے اجتماع اور تحریک کے لئے ایک نیا اور وسیع میدان پیدا ہو گیا۔

اوپر جنگجو قومیت کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ سرحدی علاقوں کے "جذبۂ آزادی" کا انتقام لینے کے لئے "ارباب اختیار" نے جبر و تشدد کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کا ردعمل پیدا ہوا۔ نیچے بھی قومیت کی لہریں اٹھنے لگیں جس نے بعض اوقات بھونڈی قسم کی جارحانہ وطن پرستی کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ یہودیوں میں صیہونیت[۱۰] کی تحریک پھیلی۔ پولستان میں جنگجو وطن پرستی اور تاتاریوں میں اتحاد اسلامی[۱۱] نے زور پکڑا۔ آرمینی، جیارجی اور یوکرینی

---

۱۰ صیہون، فلسطین میں ایک مقدس پہاڑ ہے جس کے نام سے یہودیوں کی یہ رجعت پسند سیاسی تحریک منسوب ہے۔ تحریک صیہونیت کا مقصد فلسطین میں یہودی سرمایہ داروں کی حکومت قائم کرنا ہے۔ اس تحریک میں زیادہ تر یہودی سرمایہ دار، تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ لوگ، چھوٹے بیوپاری، کاریگر اور کچھ پچھڑے ہوئے مزدور بھی شامل ہیں۔ اس تحریک کے رہنماؤں کی ہر جگہ یہ کوشش رہی ہے کہ یہودی مزدوروں کو اس جگہ کے عام مزدوروں سے الگ کر دیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدور طبقے کے اندر قومی نفاق پیدا ہوتا اور مزدور تحریک کمزور ہوتی ہے۔

۱۱ اتحاد اسلامی کا نظریہ اصل میں اوپر کے طبقوں یعنی زمینداروں، مولویوں اور تاجروں کا نظریہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان تمام قوموں کو جو مذہب اسلام کی نام لیوا ہیں ایک ہی سیاسی وحدت میں متحد کر دیا جائے۔ زار کے عہد حکومت میں روس میں ترکی اور تاتار قوموں میں اس نظریہ کا بہت زور ہو چلا تھا۔ اتحاد اسلامی سے ملتی جلتی ایک اور تحریک اتحاد ترکیہ کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی نسل سے تعلق رکھنے والی تمام مسلم اقوام کو ترکوں کی سیادت میں متحد کیا جائے۔

قوموں میں بھی قوم پرستی کو فروغ ہوا عام لوگوں میں یہودی نسل کے خلاف دشمنی کا رجحان پرورش پانے لگا۔ ان تمام باتوں سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔

قومیت کا سیلاب روز بروز زیادہ قوت کے ساتھ بڑھتا گیا۔ اس کی زد میں مزدور طبقے کی ایک بڑی تعداد کے بہ جانے کا خطرہ تھا۔ اور آزادی کی تحریک جیسے جیسے کمزور پڑتی اتنے ہی زور شور سے اس قوم پرستی کے چشمے پھوٹ پڑتے۔

اس نازک صورت حال میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی پر ایک نہایت اہم فرض عاید تھا یعنی قوم پرستی کا مقابلہ کرنا اور عوام کو اس "وبا" سے محفوظ رکھنا تھا۔ اور صرف سوشل ڈیموکریٹ ہی اسے انجام بھی دے سکتے تھے۔ وہ قوم پرستی کے مقابلہ میں بین الاقوامی اور طبقاتی جدوجہد کے اتحاد اور اٹوٹ وحدت کے آزمودہ ہتھیار سے کام لے سکتے تھے چنانچہ جتنی تیزی سے قوم پرستی کا سیلاب آگے بڑھ رہا تھا اتنے ہی زور و شور سے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو روس کی تمام قوموں کے مزدوروں کو بھائی چارہ اور اتحاد کی دعوت دینی تھی۔ اور اس سلسلے میں خاص کر سرحدی علاقوں کے سوشل ڈیموکریٹوں کو بڑی ثابت قدمی سے کام لینے کی ضرورت تھی اس لئے کہ قومی تحریک سے براہ راست انھیں کا واسطہ تھا۔

لیکن سب کے سب سوشل ڈیموکریٹ اس امتحان میں پورے نہ اترے خصوصاً سرحدی علاقوں کے سوشل ڈیموکریٹوں پر یہ بات اور زیادہ صادق آتی ہے۔ بنڈ جس نے شروع میں مشترکہ مقاصد پر زور دیا تھا، اب اپنے مخصوص اور خالص قومی اغراض کو اہمیت دینے لگی۔ حتیٰ کہ الکشن لڑنے کے لئے اس نے "سبت (ایک یہودی تہوار) کا احترام" بجالانے اور "عبرانی کے تسلیم کرانے" کو ایک اہم مسئلہ بنا دیا۔ قفقاز نے بھی بنڈ کی پیروی کی۔ قفقازی سوشل ڈیموکریٹوں کا ایک گروہ "قومی تہذیبی خود مختاری" کا فوری مطالبہ کرنے لگا حالانکہ

قفقاز کے تمام سوشل ڈیموکریٹوں کی طرح وہ بھی اسے پہلے رد کر چکے تھے۔ ہم اس موقعے پر تخریب پسندوں کی کانفرنس لہ کا تذکرہ نہیں کریں گے جس نے نہایت عیاری سے قوم پرستی کے رجحانوں پر اپنی منظوری کی مہر لگا دی ہے۔

لیکن ان سب سے ایک بات اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ قومی مسئلے پر روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے خیالات کو ابھی تک تمام سوشل ڈیموکریٹ اچھی طرح نہیں سمجھ سکے ہیں۔

اس لئے ظاہر ہے کہ قومی مسئلے پر بڑی سنجیدگی اور تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہو۔ ثابت قدم اور با اصول سوشل ڈیموکریٹوں کا فرض ہے کہ وہ قوم پرستی کی بوکھلاہٹ کے خلاف یکسوئی اور انتہا سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ کام کریں اور اس کی مطلق پرواہ نہ کریں کہ کس سمت سے یہ گمراہ کن نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔

لہ ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی شکست کے بعد روسی سوشل ڈیموکریٹک مزدور پارٹی کے کچھ لوگ جن میں اکثر منشویک تھے، انقلاب کی دشواریوں سے گھبرا کر اصلاح پسندی کا راستہ اختیار کر چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک انقلابی جماعت کی حیثیت سے روسی سوشل ڈیموکریٹک مزدور پارٹی کو توڑ دیا جائے اسی لئے انقلابی تحریک کی تاریخ میں وہ لوگ "تخریب پسند" کہے جانے لگے۔ اور چونکہ بالشویک ان کے اس خیال کے خلاف تھے اور انقلابی پارٹی کو صرف قائم ہی نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ اور زیادہ مضبوط بنا رہے تھے اس لئے تخریب پسندوں کی ساری کوششیں بالشویکوں کی مخالفت میں صرف ہونے لگیں۔ بالشویکوں کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے کے لئے اگست ۱۹۱۲ء میں ویانا میں ان لوگوں نے ایک کانفرنس کی، جسے "اگست کانفرنس" بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں اسٹالین کا اشارہ اسی کانفرنس کی ایک تجویز کی طرف ہے جو قومی مسئلے سے متعلق تھی۔ اس اگست کانفرنس کو منعقد کرنے والا اور اس کا اصلی روح رواں لیون ٹراٹزکی تھا۔

۱- قوم

قوم کی تعریف کیا ہے؟

قوم بنیادی طور سے ایک ملت کو کہتے ہیں۔ یہ آدمیوں کی ایک واضح اور معین ملت ہے۔

یہ ملت نہ تو نسلی ہے اور نہ قبائلی۔ جدید اطالوی قوم رومن، ٹیوٹن[13]، اٹرسکن[14]، یونانی اور عرب وغیرہ کے میل سے بنی ہے۔ فرانسیسی قوم کی تشکیل گال[15]، رومن، برٹین[16] اور ٹیوٹن وغیرہ سے ہوئی ہے۔ یہی بات انگریزوں اور جرمنوں پر صادق آتی ہے کہ وہ بھی مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگوں سے مل کر قوم بنے ہیں۔

---

۱۳ ٹیوٹن دراصل جرمنی کے ایک بہت پرانے قبیلے کے لوگ تھے جو دریائے ایلبے کے شمال میں رہا کرتے تھے۔

۱۴ اطالیہ میں بہت قدیم زمانے میں ایک ریاست اترور یا تھی اسی کے باشندوں کو اترورین یا اٹرسکن بھی کہتے ہیں۔

۱۵ قدیم زمانے میں فرانس کا نام گال تھا۔

۱۶ اینگلو سیکسن نسل کے حملے سے پہلے انگلستان میں جس نسل کے لوگ آباد تھے انھیں برٹین کہا جاتا تھا۔ انہی کی مناسبت سے انگلستان کا ایک نام برطانیہ بھی ہے۔

چنانچہ قوم کوئی نسلی یا قبائلی ملت نہیں بلکہ افراد کی ایک ایسی ملت ہے جو تاریخی ارتقا کی بدولت وجود میں آئی ہے۔

لیکن کیخسرو اور اسکندر کی بڑی بڑی سلطنتوں کو قوم نہیں کہا جا سکتا حالانکہ اس میں شک نہیں کہ وہ تاریخی ارتقا کے دوران میں قائم ہوئیں اور مختلف قبیلوں اور نسلوں سے مل کر بنی تھیں۔ وہ قومیں نہیں بلکہ مختلف گروہوں کا مجموعہ تھیں جن میں باہم کوئی وابستگی نہ تھی اور جو اتفاقیہ اکٹھا ہو گئی تھیں۔ ان کا منتشر ہونا یا اکٹھا رہنا کسی فاتح کی شکست یا فتح پر منحصر تھا۔

چنانچہ قوم کوئی اتفاقی یا عارضی مجمع نہیں بلکہ افراد کی ایک مستقل ملت ہے۔

لیکن ہر مستقل ملت کو قوم نہیں کہا جا سکتا۔ آسٹریا اور روس مستقل ملتیں ہیں لیکن کوئی شخص انھیں قوم نہیں کہتا۔ قومی ملت اور سیاسی ملت میں کیا فرق ہے؟ ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ایک مشترک زبان کے بغیر کسی قومی ملت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ کسی ریاست کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک مشترک زبان رکھتی ہو۔ آسٹریا میں چیک قوم اور روس میں لسانی قوم کی اگر اپنی اپنی مشترک زبان نہ ہوتی تو ان (قوموں) کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ برخلاف اس کے روس اور آسٹریا کی سالمیت پر اس واقعہ کا مطلق اثر نہیں پڑتا کہ ان کی حدود میں بہت سی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری منشا لوگوں کی بول چال کی زبان سے ہے، حکومت کی سرکاری زبان سے نہیں۔

پس زبان کا ایک ہونا کسی قوم کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ مختلف قومیں ہمیشہ اور ہر جگہ مختلف زبانیں بولتی ہیں یا ایک زبان کے بولنے والے لازماً ایک قوم بن جاتے ہیں۔ ہر قوم کے لئے ایک مشترک زبان کا

ہونا ضروری ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ مختلف قوموں کے لئے مختلف زبانیں بھی ہوں۔ ایسی کوئی قوم نہیں جو ایک ہی وقت میں کئی زبانیں بولتی ہو لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ دو قومیں ایک ہی زبان نہیں بول سکتیں۔ انگریز اور امریکی ایک ہی زبان بولتے ہیں لیکن وہ ایک قوم نہیں ہیں۔ اور یہی بات نارویجی اور ڈنمارکی اور انگریز اور آئرستانی قوموں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

لیکن جب ان کی زبان ایک ہو تو انگریز اور امریکی ایک قوم کیوں نہیں ہیں؟

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ساتھ نہیں رہتے۔ وہ مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔

(قوم اسی وقت بنتی ہے جب لوگوں میں عرصۂ دراز سے باقاعدہ میل جول قائم ہوا اور وہ پشت در پشت ایک ساتھ رہتے آئے ہوں) لیکن اگر لوگ ایک مشترک علاقے میں آباد نہ ہوں تو طول طویل مدت تک ایک ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ انگریز اور امریکی ابتدا میں ایک ہی ملک انگلستان میں آباد تھے۔ اور اس وقت وہ ایک قوم تھے۔ بعد کو انگریز قوم کا ایک حصہ انگلینڈ چھوڑ کر ایک نئے ملک امریکہ میں جا بسا اور ایک مدت گزرنے پر ایک نئی امریکی قوم بن گیا۔ وطن مختلف ہو جانے سے ایک کی دو قومیں بن گئیں۔

پس وطن کا ایک ہونا کسی قوم کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

لیکن سوال اب بھی طے نہیں ہوا۔ صرف وطن کے ایک ہونے سے ہی ایک قوم نہیں پیدا ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ایک اندرونی معاشی رشتے کی ضرورت ہے جو قوم کے مختلف اجزا کو ایک مکمل وحدت بنا دے۔ انگلینڈ اور امریکہ میں ایسا کوئی رشتہ نہیں اور اس لئے وہ دو مختلف قومیں ہیں۔ لیکن اگر امریکہ کے مختلف حصے اپنی باہمی تقسیم محنت اور ذرائع نقل و حمل کی ترقی کی بدولت مل کر ایک مکمل معاشی وحدت نہ بن جاتے تو خود امریکہ کے

الگ ہرگز ایک قوم کہے جانے کے مستحق نہ ہوتے۔

مثال کے لئے جارجیائی قوم کو دیکھئے۔ جارجیا کے لوگ اصلاح[۱۶] سے پہلے بھی ایک مشترک علاقے میں رہتے اور ایک زبان بولتے تھے پھر بھی وہ صحیح معنی میں ایک قوم نہیں تھے۔ وہ الگ الگ کئی ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں آپس میں کوئی تعلق نہ تھا اور اس لئے وہ ایک مشترکہ معاشی زندگی نہیں بسر کر سکتے تھے۔ صدیوں تک وہ آپس میں لڑتے، دوسرے ایرانیوں اور ترکوں کو ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کر کے ایک دوسرے کو لوٹتے اور قتل کرتے رہے۔ کسی زمانے میں اگر کسی کامیاب بادشاہ کی کوششوں سے ان مختلف خطوں میں عارضی اور اتفاقی اتحاد قائم بھی ہوا تو اس سے زیادہ کچھ نہ ہو سکا کہ نظم و نسق کی ایک سطحی یکسانیت پیدا ہو گئی جو وہاں کے حاکموں کی تلون مزاجی یا کسانوں کی بے پروائی کی بدولت تیزی کے ساتھ درہم برہم ہو جاتی۔ اور جارجیا میں جب معاشی اتحاد نہ تھا تو یہ صورت پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ ایک قوم کی حیثیت سے جارجیا کا نام انیسویں صدی کے آخر میں آتا ہے۔ اس زمانے میں زرعی غلامی کا خاتمہ ہوا، ملک کی اقتصادی زندگی کی نشو و نما شروع ہوئی، ذرائع نقل و حمل نے ترقی پائی اور سرمایہ داری نے سر اٹھایا۔ اور اس کی بدولت جارجیا کے مختلف ضلعوں میں باہمی تقسیم محنت قائم ہو گئی، مختلف خطوں کی معاشی بے نیازی کا بالکل خاتمہ کر دیا گیا، اور وہ ایک مجموعی نظام میں آ بندھے۔

تقریباً یہی حال ان تمام قوموں کا ہے جو جاگیرداری کے دور سے ترقی کر کے سرمایہ داری کے دور میں داخل ہوتی ہیں۔

۱۶ھ اصلاح سے مراد زرعی غلامی کا انسداد ہے جو ۱۸۶۴ء میں زار کے فرمان کے مطابق عمل میں آیا تھا۔

پس معاشی زندگی کا ایک ہونا، معاشی اعتبار سے باہم شیر و شکر ہونا کسی قوم کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

لیکن یہ بھی کافی نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہمیں ان لوگوں کی نفسیاتی کیفیتوں کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے جن لوگوں سے مل کر وہ قوم بنی ہے۔ قوموں کے حالاتِ زندگی ہی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے بلکہ ان کی نفسیاتی کیفیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ جس کا اظہار قومی تہذیب کی خصوصیتوں میں ہوتا ہے۔ انگلستان، امریکہ اور آئرستان اگر ایک زبان بولنے پر بھی الگ الگ تین قومیں ہیں تو اس کا ایک بڑا سبب ان کی مخصوص نفسیاتی بناوٹ بھی ہے جس کی نشو و نما پشت در پشت زندگی کے مختلف حالات میں رہ کر ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ نفسیاتی ساخت یا جسے "قومی کردار" بھی کہتے ہیں ایک ایسی چیز ہے جسے دیکھنے والے آسانی سے متعین نہیں کر سکتے۔ لیکن جہاں تک اس کا اظہار ایک مخصوص تہذیب میں ہوتا ہے جو اس قوم کے تمام افراد میں مشترک ہے اس حد تک وہ ایک ایسی چیز ہے جس کی تعریف مقرر کی جا سکتی ہے اور جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ظاہر ہے کہ "قومی کردار" کوئی ایسی چیز نہیں جو ایک بار ہمیشہ کے لئے مقرر ہو چکی ہو۔ زندگی کے حالات بدلتے ہیں تو اس میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ کوئی لمحہ اس کے وجود سے خالی نہیں اس لئے قوم کے قیافہ پر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔

پس نفسیاتی ساخت کا ایک ہونا جس کا اظہار ایک مشترکہ تہذیب میں ہوتا ہے، کسی قوم کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

قوم کی تمام ممتاز خصوصیتوں کو ہم پیش کر چکے۔

چنانچہ قوم ایک ایسی مستقل ملت ہے جو تاریخی ارتقا کی بدولت پیدا ہوئی اور جس کی زبان، جس کا وطن، اور جس کی اقتصادی زندگی ایک ہو اور جو ایک مخصوص نفسیاتی ساخت رکھتی ہے جس کا اظہار اس کی مشترکہ تہذیب میں ہوتا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام دوسرے تاریخی مظاہر کی طرح قوم بھی قانون تغیر کے تابع ہے۔ اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اس کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا!

یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا خصوصیتوں میں سے کوئی ایک خصوصیت قوم کی تعریف قرار پانے کے لئے کافی نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس اگر ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی موجود نہ ہو تو قوم، قوم باقی نہیں رہتی۔

ایسے لوگوں کا تصور کیا جا سکتا ہے جن کا "قومی کردار" ایک ہو۔ لیکن اگر وہ اقتصادی طور پر متحد نہیں ہیں، اگر وہ الگ الگ علاقوں میں آباد ہیں، اگر وہ مختلف زبانیں بولتے ہیں تو انھیں ہرگز ایک قوم نہ کہا جائے گا۔ مثلاً روس، گلیشیا، امریکہ، جارجیا اور قفقاز کے پہاڑی یہودیوں کا یہی حال ہے۔ وہ ہمارے خیال میں ایک قوم نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کا بھی تصور کیا جا سکتا ہے جن کا وطن اور جن کی معاشی زندگی ایک ہو۔ لیکن اس کے باوجود اگر ان کی زبان اور ان کا "قومی کردار" ایک نہ ہو تو وہ بھی ایک قوم نہیں کہلائیں گے۔ مثلاً بالٹک علاقے کے جرمنوں اور لیٹوں کا یہی حال ہے۔

اسی طرح ناروے اور ڈنمارک کے لوگ ایک زبان بولتے ہیں لیکن چونکہ دوسری خصوصیتیں موجود نہیں اس لئے انھیں بھی ایک قوم نہیں کہا جا سکتا۔

چنانچہ قوم اسی وقت بنتی ہے جب اس میں یہ تمام خصوصیتیں جمع ہو جاتی ہیں۔

کچھ لوگوں کے نزدیک "قومی کردار" قوم کی منجملہ اور خصوصیتوں میں سے ایک نہیں بلکہ

اس کی واحد بنیادی خصوصیت ہے۔ اور باقی تمام خصوصیتیں کسی قوم کی ضروری خصوصیتیں نہیں۔ ان سے تو صرف اس کی نشو و نما میں مدد پہونچتی ہے۔ اسپنگلر اور خصوصاً باؤر کا یہی خیال ہے۔ یہ لوگ آسٹریا کے مشہور سوشل ڈیموکریٹ رہنما ہیں اور قومی مسئلے پر ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

اب ہم ان کے نظریہ قومیت پر بحث کریں گے۔ اسپنگلر کے نزدیک۔

"ایک طرح سے سوچنے والے اور ایک زبان بولنے والے لوگوں کے اتحاد کا نام قوم ہے۔ یہ زمانہ حال کے لوگوں کی ملت ہے جن کی تہذیب ایک ہو مگر جو اب کسی سرزمین سے وابستہ نہیں رہے۔"

یعنی ایک طرح سے سوچنے والے اور ایک زبان بولنے والے لوگوں کے "اتحاد" کا نام قوم ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ آپس میں کس قدر غیر متحد ہیں۔ اس سے بھی بحث نہیں کہ وہ رہتے کہاں ہیں!

باؤر ایک قدم اور آگے ہے۔

وہ پوچھتا ہے "قوم کی تعریف کیا ہے؟ کیا زبان کا ایک ہونا لوگوں کو ایک قوم بنا دیتا ہے؟ لیکن انگریز اور آئرستانی ..... ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ پھر بھی وہ ایک قوم نہیں۔ یہودیوں کی کوئی مشترکہ زبان نہیں مگر وہ ایک قوم ہیں۔"

پھر قوم کیا ہے؟

"قوم ایک ایسی ملت ہے جس کا کردار نسبتاً ایک ہو۔"

لیکن کردار اور موجودہ صورت میں قومی کردار کیا چیز ہے؟ باؤر کے نزدیک قومی کردار۔

"..... ان خصوصیتوں کا مجموعہ ہے جن سے ایک قوم کے لوگوں کا دوسری قوم کے لوگوں سے فرق ظاہر ہوتا ہے ـــ یہ ان جسمانی اور نفسیاتی خصوصیتوں کا مرکب ہے جو ایک قوم کو دوسری قوم سے ممتاز کرتی ہیں۔"

لیکن باؤر جانتا ہے کہ قومی کردار آسمان سے نازل نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے یہ بھی کہنا پڑا کہ۔

"لوگوں کے کردار پر کسی اور چیز کا اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا کہ ان کی تقدیر کا ..... قوم محض ایک ایسی ملت ہے جس کی تقدیر ایک ہو (اور یہ منحصر ہے) ان حالات پر جن کے تحت لوگ اپنی روزی پیدا کرتے اور اپنی محنت کا مال تقسیم کرتے ہیں۔"

چنانچہ باؤر کے لفظوں میں قوم کی "سب سے مکمل" تعریف یہ ہوئی۔

"قوم افراد کی ایک ایسی جماعت ہے جو اپنی مشترکہ تقدیر کی وجہ سے ایک مشترکہ کردار میں متحد ہو گئی ہو۔"

پس قوم وہ ہے جس کی تقدیر ایک ہو اور اس بنا پر قومی کردار بھی ایک ہو مگر وطن، زبان یا معاشی زندگی کا ایک ہونا ضروری نہیں۔

لیکن اس صورت میں قوم میں باقی کیا رہ گیا؟ جن لوگوں میں آپس میں کوئی معاشی تعلق نہ ہو، جو الگ الگ علاقوں میں آباد ہوں، اور جو نسلاً بعد نسلاً مختلف زبانیں بولتے آئے ہوں ان میں ہم قوم ہونے کی کون سی بات رہ گئی ہے؟

باؤر یہودیوں کو ایک قوم کہتا ہے حالانکہ ان کی کوئی مشترکہ زبان نہیں ہے۔ لیکن مثال کے لئے، جارجیا، داغستان، روس اور امریکہ کے یہودیوں کی "تقدیر" میں کیا چیز "مشترک" اور ان میں کون سی قومی وابستگی ہے؟ یہ لوگ ایک دوسرے سے بالکل غیر متحد ہیں، الگ الگ علاقوں میں رہتے اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ اس سے انکار

قومی کردار (کا فرق) تو ہرگز نہ تھا. اس لئے کہ امریکہ والے انگلینڈ سے آئے تھے اور امریکہ میں اپنے ساتھ انگریزی زبان ہی نہیں بلکہ انگریزی قومی کردار بھی لیتے آئے تھے. ظاہر ہے کہ وہ یکایک اسے ترک نہیں کر سکتے تھے، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ نئی حالتوں کے زیر اثر ان کے اپنے مخصوص کردار کی نشوونما بھی ہونے لگی تھی. تاہم کردار کی کم و بیش یکسانیت کے باوجود اس وقت بھی وہ انگریزوں سے الگ ایک قوم بن چکے تھے. ظاہر ہے کہ جدید انگلینڈ بحیثیت ایک قوم کے، انگلینڈ میں بسنے والی قوم سے جو اختلاف رکھتا تھا اس کا سبب اس کا مخصوص قومی کردار نہیں تھا یا اس حد تک نہیں تھا جس حد تک زندگی کے ماحول اور حالات تھے. اور یہ انگلینڈ کے ماحول اور حالات سے بالکل مختلف تھے.

اس سے ظاہر ہے کہ کوئی واحد خصوصیت ایسی نہیں جس سے قوم کی تمیز ہو سکے. وہ تو خصوصیات کا ایک مجموعہ ہے کہ جب قوموں کا موازنہ کیا جاتا ہے تو ایک نہ ایک خصوصیت (قومی کردار، یا زبان، وطن یا معاشی حالات) زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے بحیثیت مجموعی جب یہ تمام خصوصیتیں مل جاتی ہیں تو قوم بنتی ہے.

باؤر کے نقطۂ نظر کے مطابق قوم اور قومی کردار ایک چیز ہے. وہ قوم کو اس کی مٹی سے الگ کر کے ایک ایسی چیز بنا دیتا ہے جو تمام صفات سے بے نیاز ہے. آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی. نتیجہ یہ ہے کہ قوم ایک زندہ اور باعمل قوت ہونے کے بدلے ایک پُراسرار غیر محسوس اور مافوق الفطرت چیز بن کر رہ جاتی ہے. کیونکہ میں پھر سوال کروں گا کہ وہ یہودی قوم جس میں جارجیا، داغستان، روس اور امریکہ وغیرہ کے یہودی شامل ہوں آخر کس قسم کی قوم ہے جس کے افراد ایک دوسرے کی باتیں نہیں سمجھ سکتے؟ اس لئے کہ

نہیں کیا جا سکتا کہ مذکورہ بالا یہودی وہی معاشی اور سیاسی زندگی بسر کرتے ہیں جو جارجیا، داغستان، روس اور امریکہ کے عام باشندوں کی ہے. پھر انہی کے ساتھ وہ ایک ہی تہذیبی ماحول میں رہتے ہیں. ناممکن ہے کہ اس کا ان کے قومی کردار پر کوئی واضح اثر نہ پڑے. اگر ان (دنیا کے تمام یہودیوں ـــــ مترجم) میں کوئی مشترک چیز باقی رہ گئی ہے تو وہ ان کا مذہب، ان کا نسب اور ان کے قومی کردار کی بعض نشانیاں ہیں. اس سے بالکل اختلاف نہیں، لیکن سنجیدگی کے ساتھ کیسے کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہودیوں کی "تقدیر" پر بے جان مذہبی رسمیں اور مٹتی ہوئی نفسیاتی نشانیاں، اس زندہ سماجی، معاشی اور تہذیبی ماحول سے (جو ہر دم ان کو گھیرے رہتا ہے) زیادہ گہرا نقش چھوڑ جاتی ہیں؟ اور یہودیوں کو ایک قوم اسی صورت میں کہا جا سکتا ہے جب اس مفروضہ کو صحیح مان لیا جائے.

پھر باؤر کی قوم اور روحانیت پسندوں کی پُراسرار قومی روح "میں (جو تمام صفات سے بے نیاز ہے) فرق ہی کیا ہے؟

باؤر نے قوموں کی "ممتاز خصوصیت" (قومی کردار) کو ان کی زندگی کے "حالات" سے الگ کر کے دونوں کے درمیان، ایک ناگوار خلیج پیدا کر دی ہے. لیکن قومی کردار اگر زندگی کے حالات کا عکس نہیں، اگر وہ ماحول کے مجموعی اثرات کا نام نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ قومی کردار پر بات کیسے ختم کر دی جا سکتی ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے اس مٹی سے الگ اور جدا کر دیا جائے جس نے اسے جنم دیا ہے؟

اور سچ پوچھئے تو وہ کون سی چیز تھی جس نے اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں کے شروع میں انگریز قوم اور امریکی قوم میں امتیاز پیدا کیا، حالانکہ اس وقت تک ریاست متحدہ امریکہ، جدید انگلینڈ کے ہی نام سے مشہور تھا؟

وہ مختلف زبانیں بولتے ہیں، جو دنیا کے مختلف حصوں میں رہا کرتے ہیں، جو کبھی ایک دوسرے کی صورت بھی نہیں دیکھتے، اور جو امن ہو یا جنگ کسی حالت میں بھی ساتھ مل کر قدم نہیں اٹھاتے؟ نہیں! سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو اس قسم کی کاغذی "قوموں" کے لئے اپنا قومی پروگرام نہیں مرتب کرنا ہے۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی صرف انھیں قوموں کو تسلیم کر سکتی ہے جو صحیح معنی میں قوم ہیں، جو عمل اور حرکت کرتی ہیں اور اس پہ ہی کا اصرار ہے کہ انھیں تسلیم کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ باؤئر نے قوم اور قبیلہ کو خلط ملط کر دیا ہے حالانکہ قوم، تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے اور قبیلہ، انسان کی نسلی تقسیم سے تعلق رکھتا ہے۔

برسبیل تذکرہ یہ کہہ دیا جائے کہ باؤئر کو شاید اپنی اس کمزوری کا احساس بھی ہے۔ اپنی کتاب کے شروع میں اس نے صاف صاف یہ کہا ہے کہ یہودی ایک قوم ہیں۔ لیکن کتاب کے آخر میں وہ اپنی غلطی کی اصلاح کر لیتا ہے اور لکھتا ہے کہ "سرمایہ دار سماج میں بالعموم ان (یہودیوں) کے لئے ایک قوم کی حیثیت سے باقی رہنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے"، غالباً اس لئے کہ وہ دوسری قوموں میں جذب ہونے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اور اس مجبوری کا سبب شاید یہ ہے کہ "یہودیوں کی بود و باش کے لئے کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہے"۔ یعنی وطن کا نہ ہونا ہی اس کا اصل سبب ہے۔ اس کے برخلاف چیک لوگوں کا اپنا ایک وطن ہے اور اس لئے باؤئر کی رائے میں وہ ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔

اس دلیل سے باؤئر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ یہودی مزدور قومی خود مختاری کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ لیکن اس سے باؤئر نے انجانے میں خود اپنے ہی نظریے کی تردید کر دی جس میں اس حقیقت سے انکار کیا گیا تھا کہ وطن کا ایک ہونا کسی قوم کی ایک ضروری خصوصیت ہے۔ لیکن اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ کتاب کے شروع میں باؤئر نے صاف اعلان کیا ہے کہ "یہودیوں کی کوئی مشترکہ زبان نہیں، اور اس کے باوجود وہ ایک قوم ہیں۔" لیکن صفحہ ۱۲۹ تک پہنچتے پہنچتے اس کے خیالات پلٹا کھاتے ہیں اور وہ اسی قطعیت سے اعلان کرتا ہے کہ بلاشک "ایک مشترک زبان کے بغیر کسی قوم کا وجود ممکن نہیں۔"

باؤئر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ "زبان آدمیوں میں راہ و رسم پیدا کرنے کا نہایت ہی اہم ذریعہ ہے۔" لیکن بلا ارادہ وہ ایک ایسی چیز ثابت کر گیا جس کو ثابت کرنا اس کا مقصد نہ تھا یعنی اس نے دکھا دیا کہ اس کا نظریہ اقوام جو مشترکہ زبان کی اہمیت کا منکر ہے، ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔

مختصر یہ کہ اس کے نظریے نے جس کو خیالی دھاگوں میں پرو کر ایک کیا گیا تھا، آپ اپنی تردید کر دی۔

۲- قومی تحریک

قوم تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ مگر تاریخی ارتقا کا یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جو ایک خاص عہد یعنی ابھرتی ہوئی سرمایہ داری کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ جاگیری نظام کے مٹنے اور سرمایہ داری کے ترقی کرنے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ لوگوں کے میل سے قومیں بننے لگی تھیں۔ مثلاً مغربی یورپ میں ایسا ہی ہوا۔ جس وقت سرمایہ داری نے کامیابی کے ساتھ قدم آگے بڑھایا اور غیر متحد جاگیری نظام پر فتح پائی اسی زمانے میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اطالیہ وغیرہ کے باشندوں نے قوموں کی شکل اختیار کی۔

لیکن ان صورتوں میں ان قوموں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ ان کی آزاد قومی ریاستیں بھی قائم ہوئیں۔ چنانچہ برطانوی، فرانسیسی وغیرہ قومیں ساتھ ہی ساتھ برطانوی اور فرانسیسی ریاستوں کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ آئرستان نے اس عمل میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن اس سے عام نقشے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لیکن مشرقی یورپ میں حالات نے کسی قدر مختلف صورت اختیار کی۔ مغرب میں قومیں بڑھ کر ریاستیں بن گئی تھیں۔ مشرق میں کثیر الاقوام ریاستیں قائم ہوئیں اور ہر ریاست میں متعدد قومیں تھیں۔ آسٹریا، ہنگری اور روس کا یہی حال ہے۔ آسٹریا میں سیاسی اعتبار سے جرمن سب سے زیادہ ترقی یافتہ ثابت ہوئے اور اس لئے اسی کام کا بیڑا انھوں نے اٹھایا کہ آسٹریا کی قوموں کو ملا کر ایک ریاست بنائیں۔ ہنگری میں ریاستی تنظیم کے لئے مگیار ہی سب سے زیادہ قابل نکلے۔ ہنگری کی قوموں میں انھیں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اور اسی لئے انھیں نے ہنگری کو متحد کیا۔ روس میں قوموں کو متحد کرنے کا فریضہ روسی قوم نے اپنے ذمے لیا اور اس کی پیشوائی اشرافیہ کی ایک فوجی نوکر شاہی کر رہی تھی جو تاریخی ارتقا کے دوران میں قائم ہوئی تھی اور مضبوط اور منظم تھی۔

غرضکہ مشرق میں یہی صورت ہوئی۔

ریاستیں قائم ہونے کا یہ مخصوص طریقہ صرف اسی جگہ ممکن تھا جہاں جاگیری نظام پوری طرح مٹنے نہ پایا ہو، جہاں سرمایہ داری ابھی کمزور ہو، جہاں پس ماندہ قومیں اپنی معاشی حالت کو استوار کرکے پورے معنی میں قوم بننے نہیں پائی ہوں۔

لیکن مشرقی ریاستوں میں بھی سرمایہ داری کی نشوونما ہونے لگی۔ تجارت اور ذرائع نقل و حمل کو فروغ ہوا۔ بڑے بڑے شہر قائم ہونے لگے۔ قوموں کی معاشی حالت مضبوط ہونے لگی۔ محروم و بے دخل قوموں کی پرسکون زندگی میں بھی سرمایہ داری کے چھینٹے پھوٹ نکلے۔ اس سے ان میں بیداری پیدا ہوئی اور وہ بھی برسرعمل ہو گئیں۔ اخبارات اور تھیٹروں کی ترقی اور ریشسراٹ (آسٹریا کی پارلیمنٹ) اور دوما (روسی پارلیمنٹ) کی سرگرمیوں سے "قومی جذبات" کو تقویت پہونچی۔ ایک تعلیم یافتہ جماعت پیدا ہو گئی تھی اور وہ بھی "قومی خیال" سے سرشار ہو کر اسی راہ پر گامزن ہو گئی۔

محروم قوموں میں آزاد زندگی کا احساس تو پیدا ہوا مگر اب وہ اپنی آزاد قومی ریاستیں نہیں قائم کر سکتی تھیں۔ انھیں فرمانروا قوموں کو حاکم جماعتوں کی شدید مزاحمت کا مقابلہ کرنا

پڑا جو بہت پہلے سے ہی آزاد ریاست پر قابض ہو چکی تھیں۔ ان "محروم قوموں" کو بہت دیر میں ہوش آیا۔

اس طرح آسٹریا میں چیک، اور پولستانی وغیرہ، ہنگری میں کروٹ، اور روس میں لیٹ، لتھوانی، یوکرینی، جارجیائی، ارمنی وغیرہ الگ الگ قومیں بن گئیں۔ مغربی یورپ میں جو آئرستان، ایک انوکھی چیز تھی وہ مشرقی یورپ میں ایک قاعدہ کلیہ ہو گئی۔

مغرب میں آئرستان کی اس انوکھی حیثیت کا نتیجہ ایک قومی تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مشرق میں بھی نئی بیدار ہونے والی قوموں کا یہ راستہ اختیار کرنا لازمی تھا۔ یہ تھے وہ حالات جنہوں نے مشرقی یورپ کی نئی قوموں کو جد و جہد کی راہ پر لگا دیا۔

جد و جہد شروع ہوئی اور پھیلنے لگی۔ لیکن قومیں اس میں مجموعی حیثیت سے نہیں شریک ہوئیں۔ یہ جد و جہد بالادست اور زیر دست قوموں کے صرف حکمراں طبقوں کے درمیان تھی۔ اس میں عام طور سے مظلوم قوم کا شہری متوسط طبقہ بالادست قوم کے بڑے سرمایہ داروں کے خلاف (چیک اور جرمن)، یا مظلوم قوم کے دیہاتی سرمایہ دار بالادست قوم کے زمینداروں کے خلاف (پولستان میں یوکرینی)، یا مظلوم قوم کا پورا "قومی" سرمایہ دار طبقہ بالادست قوم کے حکمراں اشرافیہ کے خلاف (روس میں پولستان، لتھوانیہ اور یوکرین) جد و جہد کرتا ہے۔ غرضکہ سرمایہ دار اس میں پیش پیش ہیں۔

نئے سرمایہ دار طبقے کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ منڈی کا مسئلہ ہے۔ اس کا مقصد اپنا مال بیچنا اور دوسری قوم کے سرمایہ داروں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی "اپنی خاص" اپنے "گھر" کی منڈی اس کے لئے محفوظ رہے۔ منڈی ہی وہ پہلا مدرسہ ہے جہاں سرمایہ دار اپنی قوم پرستی کا پہلا درس لیتے ہیں۔

لیکن عام طور سے معاملہ منڈی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بالادست قوم کی نیم جاگیری اور نیم سرمایہ دارانہ نوکرشاہی اس جد و جہد میں دست اندازی کرتی اور اپنے مخصوص طریقے سے کام کے "گرانے، دبانے اور روکنے" کی کوشش کرتی ہے۔ بالادست قوم کے سرمایہ دار خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ اپنے "مدمقابل" کے ساتھ "تیزی سے اور فیصلہ کن طریقہ" سے پیش آ سکیں۔ "قومیں" متحد کی جاتی ہیں اور "غیر ملکی" سرمایہ داروں کے خلاف انتقامی توہین کا ایک سلسلہ جاری ہوتا ہے جو آگے چل کر جبر و تشدد کی صورت اختیار لیتا ہے۔ پھر یہ جد و جہد معاشی حلقے سے سیاسی حلقے میں قدم رکھتی ہے۔ نقل و حرکت کی آزادی پر حدیں قائم ہوتی ہیں، زبان پر بندش لگائی جاتی ہے، حق رائے دہندگی محدود کر دیا جاتا ہے، مدرسوں اور مذہبی اعمال پر پابندیاں عاید کی جاتی ہیں۔ اور اس طرح "مدمقابل" کے سر پر بلاؤں کا ایک طوفان نازل ہو جاتا ہے۔ اور جابرانہ قوانین کا مقصد بالادست قوم کے سرمایہ دار طبقوں کو ہی فائدہ پہنچانا نہیں بلکہ حکمراں نوکرشاہی کے مخصوص جماعتی اغراض پورا کرنا بھی ہے۔ لیکن جہاں تک نتیجوں کا تعلق ہے، ان دونوں میں امتیاز کرنا بے معنی ہے۔ اس معاملہ میں سرمایہ دار طبقے اور نوکرشاہی دونوں ہر جگہ (خواہ آسٹریا ہنگری میں ہو یا روس میں) ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

مظلوم قوم کے سرمایہ دار ہر طرف سے مجبور ہو کر قدرتی طور سے تحریک میں کھنچ آتے ہیں۔ وہ اپنے "دیسی عوام" سے اپیل کرتے اور "مادر وطن" کے لئے چیخ پکار شروع کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا اپنا مفاد ساری قوم کا مفاد ہے۔ وہ اپنے "ہم وطنوں" میں سے "مادر وطن" کے نام پر اپنے لئے ایک فوج بھی تیار کر لیتے ہیں۔ "عوام" بھی ان کی اپیل پر ہمیشہ خاموش نہیں رہتے۔ وہ ان کے جھنڈے کے نیچے اکٹھا ہو جاتے ہیں

کیونکہ بالادستوں کے مظالم کا اثر ان پر بھی پڑتا ہے اور ان میں "ناراضگی" پیدا ہوتی ہے۔

اس طرح قومی تحریک کی ابتدا ہوتی ہے۔

قومی تحریک کی طاقت اس بات پر منحصر ہے کہ قوم کی وسیع جماعتیں، مزدور اور کسان کس حد تک اس میں شرکت کرتے ہیں۔ مزدور طبقہ سرمایہ دارانہ قوم پرستی کے پرچم تلے جمع ہوگا یا نہیں یہ اس بات پر منحصر ہے کہ طبقاتی تضاد کتنا ترقی کر چکا ہے، اور مزدوروں میں طبقاتی احساس اور اپنی تنظیم کس قدر مضبوط ہو چکی ہے۔ طبقاتی شعور رکھنے والے مزدوروں کے پاس اپنا آزمایا ہوا پرچم ہوتا ہے اور اس لئے انھیں سرمایہ داروں کے جھنڈے تلے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

قومی تحریک میں کسانوں کے حصہ لینے کا جہاں تک تعلق ہے اس کا دارومدار تشدد کی نوعیت پر ہے۔ اگر تشدد کا اثر کسان کی آراضی پر پڑا ہے، جیسا کہ آئرستان میں ہوا تو بڑی تعداد میں کسان فوراً قومی تحریک کے جھنڈے کے نیچے اکٹھا ہو جائیں گے۔

اس کے برعکس اگر جارجیا میں کوئی اہم "روس دشمن" قومی تحریک نہیں ہے تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہاں روسی زمیندار اور بڑے بڑے روسی سرمایہ دار نہیں ہیں جو عوام میں اس قسم کی قوم پرستی کو ہوا دے سکیں۔ جارجیا میں اس وقت "ارمنی دشمن" قوم پرستی کا زور ہے۔ اس لئے کہ وہاں کے بڑے بڑے سرمایہ دار ارمنی ہیں جو جارجیا کے چھوٹے اور غیر منظم سرمایہ داروں کو دباتے اور اس طرح انھیں ارمنی دشمن قوم پرستی کی آغوش میں پہنچا دیتے ہیں۔

ان حالات میں قومی تحریک یا تو عوام کی تحریک بن جاتی اور دن بدن بڑھتی رہتی ہے (جیسا کہ آئرستان میں اور گلیشیا میں ہوا)، یا چھوٹے چھوٹے بلوے اور فساد کی

شکل اختیار کر لیتی اور نمود و نمائش وغیرہ کے لئے "لڑائی" جھگڑے تک محدود رہتی ہے (جیسا کہ بوہیمیا کے بعض شہروں میں ہوا)

ظاہر ہے کہ قومی تحریک کی نوعیت ہر جگہ ایک سی نہیں ہو سکتی۔ اس کا انحصار ان مختلف مطالبوں پر ہوتا ہے جن کو تحریک لے کر اٹھتی ہے۔ آئرستان میں تحریک کی نوعیت زراعتی ہے۔ بوہیمیا میں اس کا تعلق "زبان" سے ہے۔ کسی جگہ شہری برابری اور مذہبی آزادی کا مطالبہ پیش ہے اور کہیں یہ کہ حکام "اپنی" قوم کے ہوں یا اپنی قومی اسمبلی قائم کی جائے۔ یہ طرح طرح کے مطالبے اکثر ان خط و خال کو نمایاں کرتے ہیں جو عام طور سے ایک قوم کی خصوصیت ہوتے ہیں (جیسے زبان، وطن وغیرہ)۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ہمارے سامنے کبھی بھی ایسے مطالبے نہیں آتے جن کا تعلق بائر کے ہمہ گیر "قومی کردار" سے ہو۔ اور یہ بالکل قدرتی بات ہے۔ "قومی کردار" بذات خود ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی طرح الفاظ کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا اور بقول ج۔ اشٹراسر "سیاست میں اس کا کیا کام؟"
("مزدور اور قوم" از اشٹراسر، صفحہ ۳۲)

مجموعی حیثیت سے یہی قومی تحریک کی شکلیں اور اس کے خط و خال ہیں۔

اب تک جو کچھ کہا گیا اس سے ظاہر ہے کہ ابھرتی ہوئی سرمایہ داری کی حالتوں میں قومی جدوجہد اصل میں سرمایہ دار طبقوں کی باہمی جدوجہد ہے۔ بعض اوقات سرمایہ دار طبقہ مزدور طبقہ کو بھی قومی تحریک میں شریک کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت قومی جدوجہد بادی النظر میں ایک "ہمہ گیر قومی" صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن یہ صرف ظاہری صورت تک ہی محدود ہے۔ اپنی اصلیت کے اعتبار سے وہ ہمیشہ سرمایہ داروں کی جدوجہد ہے جو خاص کر سرمایہ داروں کے حق میں مفید اور مناسب ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مزدور طبقہ قومی مظالم کے خلاف جدوجہد کرے۔ نقل و حرکت کی پابندیاں، حق رائے دہی سے محرومی، اسکولوں پر رکاوٹیں اور زبان پر بندش اور جبر و تشدد کی دوسری شکلوں سے مزدور طبقے کو سرمایہ داروں کے مقابلے میں اگر زیادہ نہیں تو کسی طرح کم نقصان نہیں پہونچتا۔ ان حالات میں محکوم قوم کے مزدور طبقے کی ذہنی قوتوں کی آزادی کے ساتھ نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ اگر تاتاری یا یہودی مزدوروں کو جلسوں اور تقریروں میں اپنی مادری زبان استعمال کرنے کی اجازت نہ ہو اور اگر ان کے اسکول بند کر دیے جائیں تو ان کی ذہنی صلاحیتوں کی ترقی کا کوئی امکان باقی نہیں رہ سکتا۔

لیکن قومی جبر و تشدد کی پالیسی مزدور طبقے کے حق میں ایک اور حیثیت سے بھی خطرناک ہے۔ یہ پالیسی آبادی کے کثیر حصے کی توجہ سماجی مسائل طبقاتی جدوجہد کے مسائل سے ہٹا کر قومی مسئلوں کی طرف پھیر دیتی ہے ایسے مسئلوں کی طرف جو مزدوروں اور سرمایہ داروں میں "مشترک" ہیں۔ اور اس سے ایک جھوٹے پروپگنڈے کی بنیاد پڑتی ہے کہ "مفاد ایک ہیں"، مزدوروں کے طبقاتی مفاد نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور ان کے ذہن پر غلامی کا گہرا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ اس سے تمام قوموں کے مزدوروں کو متحد کرنے کے کام میں سخت رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر پولستان کے مزدوروں کی ایک اچھی خاصی تعداد آج بھی سرمایہ دار قوم پرستوں کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہے، اگر آج بھی وہ بین الاقوامی مزدور تحریک سے علیحدہ ہیں تو اس کی خاص وجہ "ارباب اختیار" کی صدیوں پرانی "پولش دشمن" پالیسی ہے جو مزدوروں کی اس غلامی کے لئے زمین ہموار کرتی اور اس سے نجات پانے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہے۔

لیکن جبر و تشدد کی پالیسی یہیں تک محدود نہیں۔ اکثر یہ حکمت عملی جبر و تشدد کے "طریقے" سے گزر کر ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف بھڑکانے کا "طریقہ"، منظم قتل عام اور خونریزی کا "طریقہ" اختیار کر لیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ منظم قتل عام ہمیشہ اور ہر جگہ ممکن نہیں۔ لیکن جہاں کہیں بنیادی شہری حقوق کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کا امکان ہے وہاں یہ نہایت ہولناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس حالت میں مزدوروں کے اتحاد کو خون اور آنسوؤں کے دریا میں غرق کر دینے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ قفقاز اور جنوبی روس میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف بھڑکانے کی حکمت عملی کا مقصد "پھوٹ ڈال کر حکومت" کرنا ہے۔ اور جہاں یہ حکمت عملی کامیاب ہو جاتی ہے وہاں مزدوروں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ اور اس ریاست میں تمام قوموں کے مزدوروں کو متحد کرنے کے کام میں سخت رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔

لیکن مزدوروں کی غرض تو یہ ہے کہ ان کے تمام ساتھی ایک ہی بین الاقوامی فوج میں مل جل کر ایک ہو جائیں، اور جلد سے جلد سرمایہ داروں کی ذہنی غلامی سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کریں۔ وہ اپنے تمام بھائیوں کی، خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، ذہنی قوتوں کی مکمل نشو و نما چاہتے ہیں۔

اس لئے قومی جبر و تشدد کی پالیسی کھلے یا پوشیدہ جس روپ میں بھی سامنے آتی ہو اس کے خلاف اور ایک قوم کو دوسری قوم سے لڑانے کی پالیسی کے خلاف بھی مزدور پرزور جدوجہد کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی اس جدوجہد کو ہمیشہ جاری رکھیں گے۔

اس لئے تمام ملکوں کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں قوموں کے حق خود ارادیت کا اعلان کرتی ہیں۔

حق خود ارادیت کا مطلب ہے کہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا خود ہر قوم کا حق ہے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ قوم کی زندگی میں زبردستی دخل اندازی کرے، اس کے دستور یا دوسرے اداروں کو برباد کرے، اس کی عادتوں اور رسم و رواج کی بے حرمتی کرے، اس کی زبان کو مٹائے یا اس کے حقوق میں کمی کرے۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سوشل ڈیموکریٹ کسی قوم کے ہر رواج اور ہر ادارہ کی حمایت کریں گے۔ اگر کسی قوم پر جبر و تشدد کیا جاتا ہے تو وہ اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ مگر وہ قوم کے صرف اس حق کی حمایت کریں گے کہ اسے اپنی قسمت کا آپ فیصلہ کرنے کا حق ہو۔ مگر ساتھ ہی وہ اس قوم کی نقصان دہ رسموں اور اداروں کے خلاف آواز بلند کریں گے تاکہ اس قوم کی محنت کش جماعتیں ان سے چھٹکارا پا سکیں۔

حق خود ارادیت کا مطلب ہے کہ ایک قوم خود اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا انتظام کر سکتی ہے۔ اسے خود مختاری کی بنیاد پر اپنی زندگی کا انتظام کرنے کا حق ہے۔ اسے دوسری قوموں کے ساتھ وفاقی تعلقات قائم کرنے کا حق ہے۔ اسے بالکل علیحدہ ہو جانے کا حق ہے۔ ہر قوم مختار مطلق ہے اور ہر قوم برابر ہے۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سوشل ڈیموکریٹ کسی قوم کے ہر مطالبہ کی حمایت کریں گے۔ ایک قوم کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ پرانے نظام زندگی کو دوبارہ اختیار کر لے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی قوم کا کوئی ادارہ اگر یہ فیصلہ کرے تو سوشل ڈیموکریٹ اس کی تائید کریں گے۔ سوشل ڈیموکریٹوں کے فرائض اور کسی قوم کے حقوق، دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ سوشل ڈیموکریٹ، مزدور طبقے کے مفاد کی حفاظت کرتے ہیں اور قوم میں بہت سے طبقے شامل ہوتے ہیں۔

قوموں کے حق خود ارادیت کے لئے جدوجہد کرنے سے سوشل ڈیموکریٹوں کا مقصد قومی جبر و تشدد کی پالیسی کا خاتمہ کرنا، اور اسے ناممکن بنا دینا ہے تاکہ قوموں کی باہمی دشمنی کی کوئی بنیاد باقی نہ رہے، اس دشمنی کی دھار کند ہو جائے، اس کا اثر کم سے کم رہ جائے۔ طبقاتی شعور رکھنے والے مزدوروں کی پالیسی اور سرمایہ داروں کی پالیسی میں بنیادی فرق یہی ہے۔ سرمایہ داروں کا مقصد قومی کشمکش کو زور پہنچانا اور اس میں شدت پیدا کرنا ہے، قومی تحریک کی دھار کو تیز کرنا اور اسے ایک طول طویل تحریک بنا دینا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ طبقاتی شعور رکھنے والا مزدور طبقہ، سرمایہ داروں کے "قومی جھنڈے" تلے جمع نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بائر کی پیش کی ہوئی "ارتقائی قومی" پالیسی، مزدور طبقے کی پالیسی نہیں بن سکتی۔ بائر کی یہ کوشش کہ اس کی "ارتقائی قومی" پالیسی کو "جدید مزدور طبقہ" کی پالیسی قرار دیا جائے درحقیقت اس بات کی کوشش ہے کہ مزدوروں کی طبقاتی جدوجہد کو قوموں کی جدوجہد کے تابع کر دیا جائے۔

قومی تحریک دراصل ایک سرمایہ دار تحریک ہے۔ اس لئے لازماً اس کی قسمت سرمایہ داروں کی قسمت سے وابستہ ہے۔ اس تحریک کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ اسی وقت ہوگا جب خود سرمایہ دار طبقہ ختم ہو جائے گا۔ کامل امن صرف اشتراکیت کے عہد ہی میں قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے ڈھانچے کے اندر بھی یہ ممکن ہے کہ قومی کشمکش کو بڑی حد تک کم کیا جا سکے، اس کی جڑیں کاٹ دی جائیں اور جہاں تک ہو سکے مزدوروں کے حق میں اسے بے ضرر بنا دیا جائے۔ سوئٹزرلینڈ[1] اور امریکہ کی مثالوں سے یہی ثابت

---

[1] یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ جہاں تک سرمایہ دار ریاستوں کا تعلق ہے سوئٹزرلینڈ سب سے زیادہ جمہوری ریاست ہے۔ اس کی کل آبادی اکتالیس لاکھ پچاس ہزار ہے (باقی صفحہ ۲۲ پر)

ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ملک میں جمہوریت قائم کی جائے اور قوموں کو آزادی سے ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔

(بسلسلہ صفحہ ۱۹) جس میں تیس لاکھ جرمن زبان بولتے ہیں اور آٹھ لاکھ پچاس ہزار فرانسیسی اور ڈھائی لاکھ اطالوی بولتے ہیں۔ تینوں زبانوں کے حقوق مساوی اور تینوں سرکاری زبانیں ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں ایک اور زبان رومانش کو بھی یہی درجہ دیا گیا حالانکہ اس کے بولنے والوں کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ سوئٹزرلینڈ ایک وفاقی ریاست ہے جس میں بائیس کانتون (یا بلدی حکومتیں) اور دو نیم کانتون ہیں۔ ہر کانتون کو علاقائی خود مختاری حاصل ہے۔ ہر ایک کی اپنی پارلیمنٹ اور اپنی حکومت ہے۔ وفاقی جمہوریت کا صدر یا وزیر اعظم ایک سال کے لئے منتخب ہوتا ہے اور اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ملک میں جو مختلف نسلیں آباد ہیں، ان میں سے ہر نسل کا آدمی باری باری سے صدر ہوا کرے۔

۳۔ مسئلہ کی نوعیت

ہر قوم کو حق حاصل ہو کہ وہ آزادی کے ساتھ آپ اپنی تقدیر کا فیصلہ کرے۔ اسے حق ہے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق اپنی زندگی کا انتظام کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں وہ کسی دوسری قوم کے حقوق کو پامال نہیں کر سکتی۔

لیکن قوم کی اکثریت خصوصاً مزدور طبقہ، کے مفاد کے پیشِ نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قوم کو اپنی زندگی کا انتظام کس طرح کرنا چاہیے، اس کے آئندہ دستور اساسی کی شکل کیا ہونی چاہیے۔

ہر قوم کو خود مختاری کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تنظیم کا حق ہے۔ اسے مرکزی یا وفاقی حکومت سے منقطع علیحدہ ہو جانے کا بھی حق حاصل ہو۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ قومیں ہر حالت میں ایسا ہی کریں۔ یہ ضروری نہیں کہ خود مختاری یا علیحدگی ہر حالت میں اور ہر مقام پر قوم کی اکثریت یعنی محنت کش عوام کے حق میں مفید ہی ثابت ہو۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ ماورائے قفقاز کے تاتار قومی حیثیت سے اپنی پارلیمنٹ میں جمع ہوں اور نوابوں اور ملاؤں کے اثر میں آکر پرانے نظام زندگی کو دوبارہ قائم کرنے اور ریاست سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیں۔ خود ارادیت کے معنی کے اعتبار سے

انھیں ایسا کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن کیا ایسا کرنا تاتار قوم کے محنت کش عوام کے حق میں مفید ہوگا؟ جب مُلا اور نواب زادے قومی مسئلہ کو حل کرنے میں عوام کی رہنمائی کرنے کے لئے آگے بڑھیں تو کیا اس وقت سوشل ڈیموکریٹوں کا خاموش رہنا مناسب ہے؟ کیا سوشل ڈیموکریٹوں کا یہ فرض نہیں کہ وہ اس معاملہ میں دخل دیں اور قوم کی رائے پر واضح طور سے اپنا اثر ڈالیں؟ کیا ان کا یہ فرض نہیں کہ وہ قومی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک واضح تجویز پیش کریں جو تاتار عوام کے حق میں زیادہ سے زیادہ مفید ہو؟

لیکن کس قسم کا حل محنت کش عوام کے حق میں زیادہ سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے؟ خودمختاری، وفاق، یا علیحدگی؟ ان مسائل کا حل متعلقہ قوم کے مخصوص تاریخی حالات پر منحصر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حالات دوسری چیزوں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے مسئلہ کا حل جو ایک خاص موقع کے لئے درست ہے کسی دوسرے موقع پر نامناسب ثابت ہو سکتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں مارکس روسی پولینڈ کی علیحدگی کے حق میں تھا۔ اس کا خیال صحیح تھا کیونکہ اس وقت ایک اعلیٰ پایہ کی تہذیب کو ادنیٰ درجہ کی تہذیب کے تباہ کن تسلط سے نجات دلانے کا مسئلہ پیش نظر تھا۔ اور اس وقت یہ سوال صرف نظری اور علمی سوال نہ تھا بلکہ ایک عملی سوال تھا جس کا تعلق اس عہد کے حقیقی واقعات سے تھا۔۔۔۔۔

لیکن انیسویں صدی کے آخر میں پولینڈ کے مارکسی، پولینڈ کی علیحدگی کی مخالفت کرنے لگے۔ اور ان کی مخالفت بھی صحیح تھی کیونکہ پچاس برس میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو چکی تھیں جن سے روس اور پولینڈ اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ اس کے علاوہ اس دور میں مسئلہ علیحدگی کی حیثیت ایک علمی مسئلہ کی رہ گئی تھی جس کا عملی حقائق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مسئلہ سے اب کسی کو اگر دلچسپی رہ گئی تھی تو وہ بیرونجات میں رہنے والے اہل علم تھے۔ لیکن اس سے اس کا امکان ختم نہیں ہو جاتا کہ بعض ایسے اندرونی و بیرونی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں پولینڈ کی علیحدگی کا مسئلہ پھر اٹھ کھڑا ہو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قومی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تاریخی حالات کو جو برابر ترقی کرتے رہتے ہیں اچھی طرح دھیان میں رکھا جائے۔

کسی قوم کے اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی حالات سے ہی اس کا علم ہو سکتا ہے کہ وہ قوم اپنی زندگی کو کس طور سے منظم کرے اور آئندہ اس کے دستور اساسی کی کیا شکلیں ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ ہر قوم کے مسئلہ کو مختلف طور سے حل کرنا پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر جدلیات[۱] کی روشنی میں کسی مسئلہ کو پرکھنے کی ضرورت ہو سکتی ہے تو وہ قومی مسئلہ ہے۔

---

[۱] جدلیات وہ علم ہے جو کائنات کی چیزوں پر غور کرنے، ان کا مطالعہ کرنے اور ان کی اصلی حقیقت کو سمجھنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ جدلیات کی رُو سے کائنات کے کسی گوشے میں کوئی چیز بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ اینگلس کا قول ہے کہ "چھوٹی چیز سے لے کر بڑی تک، ریت کے ذرے سے لے کر آفتاب تک، چھوٹے جاندار سے لے کر آدمی تک، غرض کائنات کی ہر چیز ہمیشہ عالم وجود میں آتی رہتی اور منتقل رہتی ہے، ہمیشہ حرکت کرتی رہتی ہے۔ اس کی حرکت اور تبدیلیوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔" اس لئے جدلیات کی روشنی میں چیزوں کو پرکھنے کا مطلب یہ ہے کہ بقول اینگلس "چیزوں کا ان کے باہمی ربط و تعلق کی حالت میں، ان کی حرکت، ان کے نمودار ہونے اور ان کے غائب ہونے کی حالت میں مطالعہ کیا جائے۔"

اس لئے یہ ضروری ہے کہ قومی مسئلہ کو "حل" کرنے کے اس عام اور نہایت سرسری طریقے کی پوری طرح مخالفت کی جائے جسے "بند" نے پیش کیا ہے۔ لوگ آسٹریا اور جنوبی سلافی سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ انھوں نے قومی مسئلہ کا حل نکال لیا ہے اور اس لئے ہم روسی سوشل ڈیموکریٹوں کو چاہیے کہ اس حل کو قبول کر لیں۔ لوگ اسے فرض کر لیتے ہیں کہ جو بات آسٹریا کے لئے صحیح ہے وہی روس کے لئے بھی صحیح ہوگی۔ لیکن لوگ ایسا سمجھنے میں ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن عنصر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ بحیثیت مجموعی پورے روس میں بسنے والی الگ الگ ہر قوم کی زندگی کے مخصوص تاریخی حالات کو بھی۔ بھول جاتے ہیں۔

یہودی لیبر لیگ کا مشہور رہنما کاسوداسکی کہتا ہے:۔

"لیبر لیگ کی چوتھی کانگریس میں جب اس مسئلہ (قومی مسئلہ۔ استالین) کے اصول سے بحث ہوئی تو کانگریس کے ایک ممبر نے کہا کہ اس مسئلے کو جنوبی سلافی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی تجویز کے مطابق حل کیا جائے۔ اس ممبر کی رائے عام طور سے منظور کی گئی۔"

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "کانگریس نے متفقہ طور سے ..... "قومی خودمختاری کی تجویز" منظور کر لی۔"

اور بس یہی ان کا کارنامہ تھا! روس کے حقیقی حالات کے تجزیہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور نہ روس میں بسنے والے یہودیوں کی زندگی کے حالات کی تحقیق ہی کی گئی۔ انھوں نے جنوبی سلافی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا حل اُدھار لیا اسے "پسند" کیا اور

اور آخر میں متفقہ طور سے منظور کر لیا۔" یہودی لیبر لیگ روس میں قومی مسئلہ کو اسی طریقے سے حل کرنا چاہتی ہے.....

حقیقت تو یہ ہے کہ روس اور آسٹریا کے حالات ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آسٹریا کے سوشل ڈیموکریٹوں نے برون (۱۸۹۹ء) میں اپنا قومی پروگرام جنوبی سلافی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی تجویز کی روشنی میں مرتب کیا (جس میں بعض معمولی ترمیمیں بھی کی گئی ہیں)، اس طرح انھوں نے اپنے قومی مسئلے پر غیر روسی طریقے سے غور کیا اور پھر اسے غیر روسی طریقے سے حل بھی کیا۔

اس سلسلہ میں پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ برون قومی پروگرام اور جنوبی سلافی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی تجویز کے مفسرین یعنی قومی خودمختاری کے نظریہ کو مرتب کرنے والے آسٹریائی مفکرین، اسپرنگر اور بائر اس مسئلہ کو کس طرح پیش کرتے ہیں؟

اسپرنگر کہتا ہے۔

"کیا قوموں کی ایک ریاست ممکن ہے، اور خاص کر کے کیا آسٹریائی قومیں ایک ہی سیاسی وحدت قائم کرنے کی پابند ہیں، یہ ایسے ابتدائی سوالات ہیں جن کا جواب اس موقع پر دینا ضروری نہیں۔ ہمیں فرض کر لینا چاہیے کہ یہ سوال طے پا چکا ہے۔ جو شخص اس امکان اور ضرورت کو تسلیم نہیں کرتا اس کے لئے ہماری تحقیق بے کار ثابت ہوگی۔

ہمارا موضوع بحث یہ ہے کہ یہ قومیں مشترکہ وجود قبول کرنے کی پابند ہیں۔ اس صورت میں کون سی آئینی شکلیں نسبتاً زیادہ مفید ہوں گی؟"

مختصر یہ کہ ان کے نظریہ کی بنیاد آسٹریا کی سیاسی سالمیت ہے۔

باؤر بھی یہی بات کہتا ہے۔

"اس لئے ہم اسے فرض کر لیتے ہیں کہ آسٹریائی قومیں ابھی سیاسی وحدت میں رہیں گی جس میں اس وقت وہ موجود ہیں۔ اس مفروضہ کی بنیاد پر اب اس کی تحقیق کرنی ہے کہ اس وحدت میں رہ کر قومیں اپنے باہمی تعلقات اور ریاست کے ساتھ اپنے روابط کو کس شکل میں مرتب کریں۔"

باؤر کے نزدیک بھی بنیادی چیز آسٹریا کی سالمیت ہے۔

کیا روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی اس مسئلہ کو اسی طرح پیش کر سکتی ہے؟ نہیں! یہ ایسا نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ قوموں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرتی ہے جس کی رو سے ایک قوم کو علیحدگی کا حق حاصل ہے۔ یہودی لیبر لیگ کے رہنما گولڈ بلات جیسے شخص نے بھی روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی دوسری کانگرس میں اس کا اعتراف کیا کہ وہ حق خود اختیاری کے اصول کو ترک نہیں کر سکتا ہے۔ اس موقع پر گولڈ بلات نے کہا تھا۔

"حق خود اختیاری کے خلاف ایک حرف بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کوئی قوم آزادی کے لئے کوشش کرتی ہے تو ہمیں اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ اگر پولینڈ روس کے وفاق میں شامل نہیں ہونا چاہتا تو ہمیں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آسٹریائی اور روسی سوشل ڈیموکریٹوں کے خیالات کی بنیادیں بالکل ہی مختلف ہیں۔ اس صورت میں آسٹریائی سوشل ڈیموکریٹوں کے قومی پروگرام کو قبول کر لینے کا سوال مطلق پیدا نہیں ہوتا۔

آسٹریائی سوشل ڈیموکریٹ اُمید کرتے ہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی اصلاحات کے ذریعہ "قوموں کی آزادی" بتدریج حاصل کر لیں گے۔ وہ قومی خود مختاری کی ایک عملی تجویز ضرور پیش کرتے ہیں۔ لیکن کسی قسم کی بنیادی تبدیلی ان کے پیش نظر نہیں ہے اور نہ وہ اس کے لئے جمہوری تحریک آزادی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے روسی مارکسیوں کو اصلاحات پر بالکل بھروسہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک "قوموں کی آزادی" کے ساتھ ساتھ بنیادی تبدیلی کا امکان بھی ہے اور وہ آزادی کے لئے جمہوری تحریک کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی صورت ہے جس کا اقوام روس کی تقدیر پر ایک نمایاں اثر پڑے گا۔

باؤر کہتا ہے کہ

"یقیناً اس کا بہت کم امکان ہے کہ قومی خود مختاری کسی بہت بڑے فیصلہ، کسی دلیر اقدام کے نتیجہ کے طور پر حاصل ہوگی۔ آسٹریا میں قومی خود مختاری کی نشو و نما بتدریج ہوگی ۔ ۔ ۔ اس نشو و نما کی رفتار نہایت سست ہوگی جو ایک سخت اور شدید جدوجہد کے سلسلے کی کڑی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آئین سازی اور حکمرانی کی تمام مشین مفلوج ہو جائے گی۔ بنیاد دستور کسی بہت بڑے آئینی اقدام کا نتیجہ نہیں ہوگا بلکہ اس کی ترتیب علیحدہ علیحدہ صوبوں اور ملتوں کے لئے بے شمار علیحدہ علیحدہ قانون بنانے سے ہوگی۔" (ایضاً صفحہ ۴۰۴)

اسپرنگر بھی یہی کہتا ہے:۔

"مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ اس قسم کے اداروں (قومی خود مختاری کا ادارہ — استالن) کی تخلیق دو چار یا دس برس میں نہیں ہو سکتی۔ پروشیا کی حکومت کی دوبارہ تنظیم کرنے میں ایک مدت صرف ہوئی تھی ...... انھیں اپنے بنیادی حکومتی اداروں کو مستقل طور سے قائم کرنے میں بیس برس صرف ہو گئے۔ کسی کو ایسا نہیں

سمجھنا چاہئے کہ ہم کسی فریب میں ہیں۔ اس میں کافی وقت صرف ہوگا اور بڑی بڑی مشکلیں حل کرنی پڑیں گی۔"

(ایضاً صفحہ ۲۹)

یہ بات بہت صاف باتیں ہیں، لیکن کیا روسی مارکسی قومی مسئلہ کو "دلیر اقدام" سے جدا رکھ سکتے ہیں؟ کیا وہ "قوموں کی آزادی" حاصل کرنے کی غرض سے "علیحدہ علیحدہ بے شمار قانون" اور جزوی اصلاحات کا انتظار کر سکتے ہیں؟ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے اور یقیناً انھیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تو اس صورت میں روسیوں اور آسٹریوں کے جدوجہد کی شکل کیا ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوگی؟ اور کیا ان کے مواقع ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوں گے؟ اس صورت میں روسی آسٹریوں کی یک طرفہ خود مختاری کو کیونکر قبول کر سکتے ہیں؟ دو میں ایک ہی بات صحیح ہو سکتی ہے۔ جو لوگ آسٹریا والوں کی تقلید کرنا چاہتے ہیں وہ "دلیر اقدام" کے حامی نہیں ہیں یا وہ اس اقدام کے حامی ہیں مگر جانتے نہیں کہ کیا کریں۔"

اس وقت روس اور آسٹریا کے سامنے بالکل ہی مختلف فرائض ہیں۔ اور یہ فرائض قومی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مختلف طریقہ کا استعمال ضروری قرار دیتے ہیں۔ آسٹریا میں پارلیمنٹ کا دور دورہ ہے، اس لئے موجودہ حالات میں پارلیمنٹ کے بغیر کسی قسم کی ترقی اور نشوونما کا امکان نہیں ہے۔ لیکن آسٹریا کی پارلیمانی زندگی اور آئین سازی کے تمام کام قومی پارٹیوں کے باہمی تصادم کی وجہ سے معطل ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آسٹریا بہت دنوں سے ایک نہایت ہی شدید سیاسی بحران میں مبتلا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آسٹریا میں قومی مسئلہ تمام سیاسی زندگی کا محرک بن گیا ہے۔ یہ نہایت ہی اہم مرکزی مسئلہ ہے۔ اس لئے آسٹریا کے سوشل ڈیموکریٹ اگر قوموں کے باہمی تصادم اور کشمکش کو سب سے پہلے حل کرنے کی کوشش کریں تو اس پر تعجب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ اس تصادم کو موجودہ پارلیمانی نظام کی بنیاد پر یا پارلیمانی طریقوں کے ذریعے ہی حل کرنا چاہیں گے۔ ....

لیکن روس میں ایسا نہیں ہے۔ اولاً تو بقول شخصے "خدا کا شکر ہے کہ روس میں کوئی پارلیمنٹ نہیں ہے"[۳]۔ دوسرے یہ کہ روس کی سیاسی زندگی کا محرک قومی مسئلہ نہیں بلکہ زرعی مسئلہ ہے۔ چنانچہ روسی مسئلہ، اور اس لئے "قوموں کی آزادی" کے مسئلہ کا تعلق زرعی مسئلہ کے حل سے ہے۔ یعنی اس کا تعلق زرعی غلامی کے نظام کے باقیات کی تخریب یعنی ملک میں جمہوری زندگی کو رواج دینے سے ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روس میں قومی مسئلہ کی حیثیت ایک آزاد اور فیصلہ کن مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ مسئلہ ملک کی آزادی کے عمومی اور نسبتاً زیادہ اہم مسئلہ کا ایک جزو ہے۔

"آسٹریائی پارلیمنٹ کی ناکامی کا سبب" اسپرنگ لکھتا ہے۔

"یہ ہے کہ اس کا ہر اصلاحی اقدام قومی پارٹیوں کے باہمی اضداد کو ابھار دیتا ہے جس کی وجہ سے ان کے اتحاد کے کمزور ہونے کا خطرہ ہے۔ اس لئے پارٹیوں کے رہنما ہر اس چیز سے پرہیز کرتے ہیں جس میں اصلاح کی ذرا سی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس صورت میں آسٹریا میں ترقی کا امکان اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ تمام قوموں کے ناقابل تنسیخ آئینی حقوق مقرر کر دئے جائیں۔ اس سے انھیں پارلیمنٹ میں طاقتور قومی جماعتیں قائم رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور انھیں اقتصادی اور سماجی مسائل کو حل کرنے کے لئے توجہ دینے کا موقع مل سکے گا۔" (ایضاً۔ صفحہ ۲۹)

۳؎ یہ جملہ گلکٹ تمف کا کہا ہوا ہے جو کسی زمانے میں زار روس کا وزیر اعظم تھا۔

LIBRARY

بار بھی یہی کہتا ہے:۔

"ریاست کے لئے قومی امن وصلح بنیادی طور سے ضروری ہے۔ ریاست زبان کے احمقانہ مسئلہ، یا زبان کے مسئلہ پر مشتعل لوگوں کے جھگڑوں سے، یا کسی نئی جماعت کے خیال سے متاثر ہو کر آئین سازی کے کاموں میں جمود اور تعطل پیدا ہونے دینا گوارا نہیں کر سکتی۔" (ایضاً صفحہ ۳۰۴)

یہ تو بہت ہی صاف باتیں ہیں۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ روس میں قومی مسئلہ کی حیثیت بالکل ہی مختلف ہے۔ روس میں تمام ترقی کا انحصار زرعی مسئلہ کے حل پر ہے، قومی مسئلہ پر نہیں ہے۔ یہاں قومی مسئلہ ایک ثانوی مسئلہ ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ ہمارے سامنے ایک دوسری شکل میں پیش ہوتا ہے۔ یہاں اس مسئلہ کے امکانات بالکل ہی مختلف ہیں۔ اس لئے یہاں جدوجہد کے مختلف طریقے اختیار کرنے پڑیں گے اور بالکل ہی مختلف فوری کاموں کا تعین کرنا ہوگا۔ حالات میں بنیادی اختلاف ہے۔ اس لئے جو لوگ وقت اور مقام کا لحاظ کئے بغیر اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں وہی آسٹریا والوں کی پیروی کرنے اور ان کے پروگرام کو قبول کرنے کی باتیں کر سکتے ہیں۔

ہمیں مخصوص تاریخی حالات کی بنیاد پر سوچنا چاہئے اور جدلیات کے اصولوں کے مطابق اس مسئلہ کو مرتب کرنا چاہئے، کیونکہ اسے ترتیب دینے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

۴۔ قومی خودمختاری

ہم آسٹریائی قومی پروگرام کے خارجی پہلوؤں کا تذکرہ اوپر کر چکے ہیں۔ ہم نے ان اسباب کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کی بنا پر روس کے مارکسی، آسٹریا کے سوشل ڈیموکریٹوں کے پروگرام کو قبول کرنے سے معذور ہیں۔

اب ہمیں اس پروگرام کو پرکھ کر دیکھنا ہے۔ ان کا قومی پروگرام کیا ہے؟ اس پروگرام کو قومی خودمختاری کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں:۔

(۱) وہ بوہیمیا یا پولینڈ کو، جہاں چیک اور پول قومیں آباد ہیں، خودمختاری عطا نہیں کرتے، بلکہ چیک اور پول قوموں کو خودمختاری عطا کرتے ہیں۔ وہ جغرافیائی خطہ کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ انہیں اس سے بحث نہیں کہ یہ قومیں آسٹریا کے کس حصہ میں آباد ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اسے قومی خودمختاری کہتے ہیں، علاقہ جاتی خودمختاری نہیں کہتے۔

(۲) چیک، پول اور جرمن وغیرہ جو آسٹریا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں انہیں انفرادی طور سے منظم کر کے ایک ایک سالم قوم بنا دیا جائے گا۔ یہ سالم قومیں آسٹریائی ریاست کا حصہ بن جائیں گی۔ اس طرح آسٹریا خودمختار علاقوں کا وفاق نہیں، بلکہ خودمختار قوموں کا وفاق

بن جائے گا۔

(۳) پول، چیک اور دوسری قوموں کے لئے جو قومی ادارے قائم کئے جائیں گے انھیں محض "تہذیبی" معاملات میں اختیار حاصل ہوگا۔ "سیاسی" مسائل پر انھیں کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔ سیاسی مسائل آسٹریا کی وفاقی پارلیمنٹ کے اختیار میں ہوں گے۔

اسی لئے اس خود مختاری کو تمدنی خود مختاری، قومی تمدنی خود مختاری کہتے ہیں۔

آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے برون کانگرس میں (۱۸۹۹ء) جو پروگرام وضع کیا تھا حسب ذیل ہے:۔

"آسٹریا کی قوموں کے باہمی عناد سے سیاسی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں ۔۔۔ قومی مسئلہ کو مکمل طور سے حل کرنے کا مطالبہ ۔۔۔ خاص طور سے ایک تہذیبی مطالبہ ہے ۔۔۔ اس مسئلہ کا تشفی بخش حل ایک جمہوری سماج میں ہی ہو سکتا ہے جس کی تعمیر ہمہ گیر بلا واسطہ اور مساویانہ حق رائے دہی کی بنیاد پر ہی ہو سکتی ہے"

ان باتوں کا تذکرہ کرکے پروگرام میں یہ کہا گیا ہے کہ:۔

"آسٹریا کے باشندوں کی قومی خصوصیات کی حفاظت اور نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ انھیں مساوی حقوق حاصل ہوں اور کسی قسم کے جور و ظلم کا وجود نہ رہے۔ اس لئے ریاست کی تمام دفتری مرکزیت اور انفرادی صوبوں کے تمام جاگیری مراعات کو منسوخ کر دینا نہایت ضروری ہے۔

صرف انھیں حالات میں آسٹریا میں قومی انتشار کو مٹا کر ایک متحدہ قومی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس غرض سے مندرجہ ذیل اصولوں کو اپنانا ازحد ضروری ہے:۔

(۱) آسٹریا کو تمام قوموں کی جمہوری ریاستوں کا ایک وفاق بنا دینا چاہیے۔

(۲) پہلے سے جو شاہی علاقے چلے آتے ہیں ان کی بجائے قومی لحاظ سے ان کے قومی حدود متعین کر دئے جائیں اور ہر ایک کے اندر سوراجی ادارے قائم کر دئے جائیں۔ تمام آئینی اور انتظامی امور قومی پارلیمنٹ کے سپرد کر دئے جائیں۔ قومی پارلیمنٹ کا انتخاب ایک ہمہ گیر بلا واسطہ اور مساویانہ حق رائے دہی کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔

(۳) کسی ایک قوم کے تمام سوراجی اضلاع کو متحد کرکے ایک مشترکہ قومی وفاق کی تشکیل کر دینی چاہئے۔ یہ قومی وفاق مکمل خود مختاری کی بنیاد پر اپنے تمام قومی معاملات کا انتظام کرےگا۔

(۴) شاہی پارلیمنٹ ایک قانون کے ذریعہ قومی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرے گی۔"

پروگرام کے آخر میں آسٹریا کی تمام قوموں سے اتحاد و یک جہتی کی اپیل کی گئی ہے۔

اس پروگرام کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ "علاقہ واریت" کے بعض پہلوؤں کو پروگرام میں شامل رکھا گیا ہے، لیکن عام اعتبار سے یہ قومی خود مختاری کے خیال کی عملی شکل ہی ہے۔ اسی لئے اسپرنگر نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا ہے۔ باؤر کے نزدیک یہ پروگرام قومی خود مختاری کے "نظریہ کی فتح" ہے۔ اس کی مزید تصریح کی غرض سے وہ اس پروگرام کی دفعہ ۴ میں ترمیم کرنا چاہتا ہے جو یہ ہے کہ "سوراجی علاقہ کی ہر قومی اقلیت کو ایک قانونی پبلک کارپوریشن کی شکل میں منظم کر دیا جائے" تاکہ وہ اپنے تعلیمی اور تہذیبی معاملات کا انتظام کر سکیں۔

آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا قومی پروگرام یہی ہے۔

اب ہمیں اس کی علمی (سائنٹفک) اساس کی تحقیق کرنی ہے۔

آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی قومی خود مختاری کی کن اسباب کی بنا پر حمایت کرتی ہے؟ قومی خود مختاری کے نظریہ کی ترتیب کرنے والے اسپرنگر اور باؤر اس ضمن میں کیا کہتے ہیں؟

ان کے نزدیک قوم افراد کا ایک ایسا اجتماع ہے جسے کسی خاص علاقے سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ ان کے قومی خود مختاری کا نظریہ ان کے اسی بنیادی تصور کا نتیجہ ہے۔ سپرنگر کہتا ہے:-

"یہ ضروری نہیں کہ قوم کسی علاقہ سے تعلق رکھتی ہو۔ یہ اشخاص کی ایک خود مختار جماعت ہے۔"

خود باؤر بھی قوم کو "اشخاص کی ملت" قرار دیتا ہے جسے اکیلے "کسی خاص علاقہ میں کامل اقتدار حاصل نہیں ہے۔"

لیکن یہ اشخاص جن سے قوم بنتی ہے ہمیشہ کسی ایک سالم ملت کی شکل میں زندگی بسر نہیں کرتے۔ اکثر وہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور اس شکل میں وہ مختلف اجنبی قومی ریاستوں میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی کارستانی ہے جو انھیں روزی کی تلاش میں دوسرے خطوں اور شہروں میں منتقل ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اجنبی قومی علاقوں میں داخل ہو کر ان کی حیثیت ایک اقلیت کی ہو جاتی ہے۔ مقامی قومی اکثریت کے دباؤ کا انھیں خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے۔ ان کی زبان اور اسکولوں پر پابندیاں عائد ہونے لگتی ہیں۔ اس سے قومی تصادم ہونے لگتا ہے۔ اس لئے علاقہ وار خود مختاری "ناموزوں" سمجھی گئی۔ اسپرنگر اور باؤر کے نزدیک اس نوع کی صورت حال میں مسئلہ کا حل محض یہ ہے کہ کسی قوم کی اقلیت کو جو ریاست کے مختلف حصوں میں منتشر ہو چکی ہے ایک بین العلاقائی قومی وفاق میں منظم کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک قومی اقلیتوں کے تہذیبی مفاد کا تحفظ اسی قسم کے وفاق کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ قومی عناد بھی صرف اسی کے ذریعے سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اسپرنگر کہتا ہے:-

"اسی لئے قوموں کو منظم کرنے اور انھیں حقوق و اختیارات دینے کی ضرورت ہے ..... قانون مرتب کر لینا تو بہت آسان ہے، لیکن کیا یہ کوئی موثر قانون ہوگا؟ اگر کوئی کسی قوم کے لئے قانون بنانا چاہتا ہے تو اسے پہلے قوم کی تخلیق کرنی چاہئے..... جب تک قوموں کی تخلیق نہ ہو جائے قومی حقوق وضع کرنا اور قومی عناد کو ختم کرنا غیر ممکن ہے۔" (صفحہ ۲۱)

باؤر بھی یہی کہتا ہے: "مزدور طبقہ کے مطالبہ" کے طور پر وہ اس امر کی تجویز کرتا ہے کہ "اقلیتوں کو ان کی شخصی بنیاد پر قانونی پبلک کارپوریشن کی شکل میں منظم کر دیا جائے۔"

لیکن قوم کی تنظیم کس طور سے کرنی چاہئے؟ اس امر کا فیصلہ کس طرح ہوگا کہ ایک فرد کس قوم کا رکن ہے؟ اسپرنگر کہتا ہے:-

"قومیت کا تعین سرٹیفیکیٹ کے ذریعہ سے ہوگا۔ علاقوں کے ہر سکونت پذیر فرد کا فرض ہوگا کہ وہ اپنی قومیت کا اعلان کرے۔" (صفحہ ۱۲۹)

باؤر کہتا ہے کہ "شخصی اصول سے مراد یہی ہے کہ آبادی مختلف قوموں میں منقسم ہے۔ بالغ شہریوں کے اعلان کے مطابق قوموں کی فہرست مرتب کی جائے گی۔" (صفحہ ۳۵۴)

باؤر آگے چل کر کہتا ہے: "متجانس اضلاع کے تمام جرمن اور غیر متجانس اضلاع کے جرمن جن کا نام قوموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے، دونوں کو ملا کر ایک جرمن قوم کی تعمیر ہوگی جو اپنی قومی مجلس منتخب کرے گی۔" (صفحہ ۳۶۰)

یہی اصول چیک اور پول قوموں پر بھی عائد ہوتا ہے۔

اسپرنگر کہتا ہے کہ "قومی مجلس متحدہ قوم کی ایک تہذیبی اور تمدنی پارلیمنٹ کی حیثیت

دلچسپی ہے۔ قومی تعلیم، قومی ادب، علوم و فنون، اکاڈمی، میوزیم، گیلری اور تھیٹر وغیرہ کی تعمیر کے متعلق اس مجلس کو اصول وضع کرنے اور طریقے مرتب کرنے یعنی ان اداروں کی سرپرستی کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔" (صفحہ ۲۰۰)

قوم کی تنظیم اور اس کے مرکزی ادارہ کی تعمیر کا یہ نقشہ ہے۔

باؤر کا خیال ہے کہ "آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی بین الطبقاتی اداروں کی تعمیر کے ذریعہ "قومی کلچر کو۔۔۔۔ سارے عوام کی ملکیت بنا دینا چاہتی ہے، اور اس طرح قوم کے تمام ارکان کو ایک قومی تمدنی ملت میں مدغم کر دینا چاہتی ہے۔" (صفحہ ۵۳۱)

آپ سمجھیں گے کہ ان تمام تصریحات کا تعلق آسٹریا سے ہے۔ لیکن باؤر کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ زور دے کر کہتا ہے کہ قومی خود مختاری تمام ریاستوں کے لئے ضروری ہے جن میں آسٹریا کی طرح مختلف قومیں آباد ہیں۔ باؤر کے نزدیک:

"کثیر الاقوام ریاست کی تمام قوموں کا مزدور طبقہ قومی خود مختاری کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ ملکیت دار طبقوں کی قومی حکومت کی پالیسی کا مخالف ہے۔" (صفحہ ۳۳۳)

وہ آگے چل کر قومی خود مختاری کے لئے حق خود ارادیت کی اصطلاح غیر محسوس طور سے استعمال کرتا ہے: "اس طرح ایک کثیر الاقوام ریاست میں قومی خود مختاری، قوموں کا حق خود ارادیت تمام قوموں کے مزدور طبقہ کا دستوری پروگرام بن جائے گا۔" (صفحہ ۳۱۹)

اسے کامل یقین ہے کہ اسپرنگر اور اس کے بنائے ہوئے "بین الطبقاتی" "قومی وفاق" "مستقبل کے سوشلسٹ سماج کی ابتدائی شکل ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ "سماج کا سوشلسٹ نظام ۔۔۔۔ بنی نوع انسان کو ایسی قوموں میں تقسیم کر دے گا جن کی قومی سرحدیں متعین ہوں گی۔" "سوشلسٹ عہد میں انسان خود مختار قومی ملتوں میں منظم ہوگا۔" "اور اس طرح سوشلسٹ سماج واضح طور پر

کے قومی اتحاد (یونین) اور علاقہ داری کارپوریشن کی ایک دلچسپ، رنگارنگ تصویر پیش کرے گا۔" اور اس اعتبار سے قومیت کا سوشلسٹ اصول قومیت اور قومی خود مختاری کے اصولوں کی اعلیٰ ترین اختلاطی شکل ہے۔" (صفحات ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۳۳)

باؤر اور اسپرنگر کی تصانیف میں قومی خود مختاری کی حمایت میں یہی دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ پہلی چیز جو نظر کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قومی خود مختاری کے لئے حق خود ارادیت کی اصطلاح خواہ مخواہ اور بلا وجہ استعمال کی گئی ہے۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں: یا تو باؤر خود ارادیت کے معنی سمجھنے سے قاصر رہا ہے یا یہ کہ اس نے اس کے مفہوم کو سمجھ کر قصداً اسے تنگ پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ اس میں مطلق شک نہیں کہ (۱) قومی خود مختاری ایک کثیر الاقوام ریاست کی سالمیت کو پہلے ہی تسلیم کر لیتی ہے، بر خلاف اس کے خود ارادیت اس سالمیت پر سبقت لے جاتی ہے اور (۲) خود ارادیت ہر قوم کو حق فرمانروائی عطا کرتی ہے، بر خلاف اس کے قومی خود مختاری محض "تہذیبی" حقوق دیتی ہے۔ حق خود ارادیت کا یہ پہلا اصول ہے۔

دوسرے یہ کہ مستقبل میں بعض ایسے اندرونی و بیرونی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر ملک کی ایک نہ ایک قوم کثیر الاقوام ریاست سے علیحدہ ہو جانے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس حالت میں قومی خود مختاری کا کیا انجام ہوگا جو تمام قوموں کے مزدور طبقہ کے لئے لازم اور ناگزیر ہے؟

قومی مسئلہ کا کیا یہی کوئی "حل" ہے جس کی رو سے قوموں کو مجبور و معذور کر کے ریاست کی سالمیت برقرار رکھی جا سکے؟

قومی خود مختاری قوموں کی ترقی اور اتحاد کی منافی ہے۔ قومی خود مختاری کا نظریہ قوموں

کی تنظیم پر زور دیتا ہے۔ لیکن کیا بناوٹی طور سے انھیں مربوط کر کے ایک سالم قوم بنائی جا سکتی ہے جب کہ روزمرہ کی حقیقی زندگی میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اقتصادی نشوونما کی بنا پر قوم کے تمام اجزا منتشر ہو کر مختلف علاقوں میں پھیل گئے ہیں؟ اس میں مطلق شک نہیں کہ سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں قومیں آپس میں مربوط اور منسلک ہو گئی تھیں۔ لیکن اس حقیقت میں بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سرمایہ داری کے اعلیٰ ترقی یافتہ دور میں قوموں میں انتشار و پراگندگی کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صورت ہے کہ جماعت کی جماعت اپنی قوم سے علیحدہ ہو کر تلاش معاش کے لئے دوسرے خطوں میں منتقل ہو جاتی ہے اور وہ ریاست کے دوسرے علاقوں میں جا کر آباد ہوتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ان نو آباد جماعتوں کے پرانے تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔ نئی جائے سکونت میں ان کے نئے نئے رشتے اور تعلقات پیدا ہوتے ہیں، ان کے عادات اور مذاق میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے اور اپنی پشت در پشت زندگی کے دوران میں وہ نئے عادات، یا مذاق اور اکثر حالات میں ایک نئی زبان بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا اس قدر تبدیلی ہو جانے پر بھی ان جماعتوں کو ایک سالم قومی اتحاد میں منسلک کیا جا سکتا ہے؟ ان ناقابل اتحاد اجزا کو متحد کرنے کا کوئی جادو ہے؟ کیا اس امر کا امکان ہے کہ ساحل بالٹک کے صوبوں کے جرمنوں کو ماورائے قفقاز کے جرمنوں سے "متحد کر کے ایک سالم قوم بنا دی جائے"؟ لیکن اگر اس کا امکان نہیں ہے تو پھر قومی خود مختاری کے تصور کو پرانے قوم پرستوں کے خیالی نظریہ سے اختلاف کہاں باقی رہتا ہے جو تاریخ کے پہیے کو پیچھے کی طرف متحرک کرنا چاہتے تھے؟

لیکن کسی قوم کی یک جہتی اور یکسانیت محض نقل وطن سے ہی زائل نہیں ہوتی ہے۔ اس یک جہتی اور یکسانیت کے زائل ہونے کے بعض اندرونی اسباب بھی ہیں۔ اس کا خاص سبب طبقاتی جنگ کی روزافزوں شدت ہے۔ سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں سرمایہ دار اور مزدور طبقوں کو ہم ایک "مشترکہ تہذیبی ملت" کہہ سکتے تھے۔ لیکن بڑے پیمانے کی صنعت کی نشوونما کے ساتھ ساتھ طبقاتی جنگ شدید اور پُر زور ہوتی جاتی ہے اور اس وقت یہ "ملت" منتشر ہونے لگتی ہے۔ جب ایک قوم کے مالکوں اور مزدوروں میں کوئی مناسبت باقی نہیں رہتی تو انھیں "ایک مشترکہ تہذیبی ملت" کہنا سنجیدگی کے خلاف ہے۔ جب سرمایہ دار جنگ پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اور جب مزدور طبقہ "جنگ پر جنگ" کا اعلان کرتا ہے تو ان کی "مشترکہ تقدیر" میں کون سا مشترکہ پہلو باقی رہتا ہے؟ کیا ان متضاد عناصر سے کسی بین الطبقاتی قومی اتحاد کی تشکیل کی جا سکتی ہے؟ اور اس حقیقت کی روشنی میں کوئی شخص "قوم کے تمام ارکان کو ایک قومی تہذیبی ملت میں ضم کرنے" کا نام لے سکتا ہے؟ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قومی خود مختاری کا تصور طبقاتی جنگ کی تمام رفتار کا مخالف ہے؟

لیکن ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیں کہ "قوم کو منظم کرو!" ایک عملی نعرہ ہے جب سرمایہ دار قوم پرست قوم کی "تنظیم" کی کوششیں کرتے ہیں تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے ان کی نیت پارلیمنٹ کے انتخابات کے لئے زیادہ ووٹ حاصل کرنا ہے۔ لیکن سوشل ڈیموکریٹک رہنماؤں نے "قوموں کی تنظیم"، "قوموں کی ترتیب" اور "قوموں کی تخلیق" کا پیشہ کب سے اختیار کر لیا؟

یہ کیسے سوشل ڈیموکریٹ ہیں جو طبقاتی جنگ کی انتہائی شدت کے زمانہ میں بین الطبقاتی اتحاد کی تنظیم کرنے لگے؟ اب تک ہر سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی طرح آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا بھی ایک ہی مقصد تھا یعنی مزدور طبقہ کی تنظیم کرنا۔ شاید یہ مقصد پرانا اور فرسودہ ہو گیا

ہے۔ اور اس نے اشپرنگر اور باؤر قوم کی "تخلیق" اور "تنظیم" کا ایک نیا مقصد پیش کر رہے ہیں جو نسبتاً زیادہ جوشیلا اور سنسنی خیز مقصد ہے۔

اس کے علاوہ دستور نے بھی بعض ذمہ داریاں عائد کی ہیں، جنہوں نے قومی خود مختاری کو منظور کر لیا ہے وہ اس "جدید" مقصد کو بھی قبول کر لیں۔ لیکن اس مقصد کو قبول کر لینے کے معنی اپنی طبقاتی راہ کو ترک کر کے قوم پرستی کی راہ اختیار کر لینے کے ہیں۔

اشپرنگر اور باؤر کی خود مختاری، قوم پرستی کی ایک چھپی ہوئی شکل ہے۔

اور یہ کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے کہ آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا قومی پروگرام خاص طور سے "لوگوں کی قومی خصوصیات کے تحفظ اور نشوونما" پر زور دیتا ہے۔ ذرا غور کیجئے، ماورائے قفقاز کے تاتار اپنے ایک تہوار کے موقعے پر اپنے کو کوڑے لگاتے ہیں۔ جارجیائی قوم میں انتقام اور قصاص کا رواج ہے۔ اب ان قومی خصوصیات کا تحفظ کیجئے!

اس قسم کا مطالبہ ایک سرمایہ دار قومی پروگرام میں اچھی طرح کھپ سکتا ہے، اور آج اگر یہ مطالبہ آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے پروگرام میں نظر آتا ہے تو محض اس لئے کہ قومی خود مختاری اسے روا رکھتی ہے، مسترد نہیں کرتی۔

قومی خود مختاری اگر آج ناموزوں اور غیر مناسب ہے تو کل کے سماج، ایک سوشلسٹ سماج میں، وہ اور بھی زیادہ غیر موزوں اور نامناسب ہوگی۔

موجودہ دور میں انسانی ترقی اور نشوونما کی تاریخ باؤر کی اس پیشین گوئی کو کہ انسان کی تقسیم ایسی ملتوں میں ہو گی جن کی قومی حدود متعین ہوں گی، غلط ثابت کر چکی ہے۔ آج تمام قومی دیواریں مضبوط اور مستحکم ہونے کے بدلے منہدم اور سرنگوں ہو رہی ہیں۔

۱۸۴۸ء میں مارکس نے اعلان کیا تھا کہ عوام کے قومی اختلافات اور منافشتے روز بروز

قائم رہتے ہیں" اور مزدور طبقہ کی قوت اور برتری اسے اور بھی جلد فنا کر دے گی۔ ۱۸۴۸ء کے بعد سے اس وقت تک انسان کی ترقی اور نشوونما جس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ پیداوار میں بھی بے انتہا ترقی ہوئی، قوموں میں تغیر و تبدل، پہلے سے نسبتاً زیادہ بڑے علاقوں میں عوام کی خلط ملط عام طور سے مارکس کے خیال کی تصدیق کرتے ہیں۔

باؤر کے نزدیک سوشلسٹ سماج "اشخاص کے قومی اتحاد (یونین) اور علاقہ داری کارپوریشن کی ایک رنگارنگ تصویر پیش کرے گا۔" اس تصریح کے ذریعے باؤر مارکس کے تصور اشتراکیت کی جگہ باکونین کے تصور کو تقویت دینا اور اس کی حمایت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اشتراکیت کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ ان کوششوں میں ناکامی کے عناصر پوشیدہ ہیں۔ ہم باؤر کے "سوشلسٹ اصول قومیت" سے بحث نہیں کریں گے جو طبقاتی جنگ کے سوشلسٹ اصول کو ختم اور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ "اصول قومیت" کو قائم کرتا ہے۔ جب قومی خود مختاری کا دار و مدار اسی قسم کے مشتبہ اصول پر ہے تو ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس سے مزدور طبقہ کی تحریک کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی قوم پرستی اچھی طرح نمایاں نہیں ہوتی کیونکہ سوشلسٹ لفاظیوں کے ذریعے اسے نہایت چالاکی سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ یہ مزدور طبقہ کے حق میں اور بھی زیادہ مضر ہے۔ بے پردہ قوم پرستی کا مقابلہ ہم آسانی سے کر سکتے ہیں کیونکہ اسے فوراً پہچان سکتے ہیں۔ لیکن ایک ایسی قومیت پرستی کا مقابلہ کرنا کسی قدر مشکل ہے کیونکہ اس کے چہرے پر سوشلزم کی نقاب ہے اور اس لئے اسے پہچاننا بہت مشکل ہے۔ چونکہ سوشلزم کا ہتھیار اس کا محافظ ہے اس لئے اسے شکست دینا کسی قدر مشکل ہے۔ اس کی جڑ مزدوروں میں ہے، اس لئے ساری فضا مکدر کرتی ہے، مزدوروں میں گروگن

خیالات پھیلتے ہیں، اور مختلف قوموں کے مزدوروں میں باہمی بے اعتمادی شک، شبہ، اور کنارہ کشی پیدا ہوتی ہے۔

قومی خودمختاری کے نظریہ سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوتا ہے، اس سے صرف کنارہ کشی اور بے اعتمادی ہی پیدا نہیں ہوتی ہے، بلکہ مزدور طبقہ کی متحدہ تحریک بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ قومی خودمختاری کے خیال کی وجہ سے ایک ایسا نفسیاتی ماحول پیدا ہوتا ہے جو مزدور طبقہ کی متحدہ پارٹی میں پھوٹ پڑنے اور قومیت کی بنیاد پر ان کی علیحدہ علیحدہ پارٹیاں بن جانے کے موافق ہے۔ پارٹی کے اس طرح ٹوٹنے سے مزدور سبھائیں بھی ٹوٹنے لگتی ہیں، اور مزدور عوام ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنے اپنے طور سے تنہا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مزدور طبقہ کی متحدہ تحریک ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے، وہ علیحدہ علیحدہ قومی شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔

آسٹریا میں جو "قومی خودمختاری" کا مولد ہے، اس کی نہایت تکلیف دہ مثالیں ملتی ہیں۔ ۱۸۹۷ء (جبکہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی کانگرس ومبرگ میں ہوئی تھی) کے بعد سے آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی جو ایک وقت میں بہت ہی متحد اور منظم تھی ٹوٹنے لگی اور اس میں سے علیحدہ علیحدہ پارٹیوں کا جنم ہونے لگا۔ پارٹی کی برون کانگرس ۱۸۹۹ء کے بعد جب کہ قومی خودمختاری کی تجویز منظور ہوئی تھی اس کی رفتار اور بھی زیادہ تیز ہو گئی۔ حالات نے اس قدر ابتر صورت اختیار کر لی کہ آج وہاں ایک متحدہ بین الاقوامی پارٹی کے بدلے چھ مختلف قومی پارٹیاں موجود ہیں جن میں سے چیک سوشل ڈیموکریٹک پارٹی جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے معمولی سا ربط بھی قائم رکھنا گوارا نہیں کرتی۔

لیکن مزدور سبھائیں بھی انہیں پارٹیوں سے وابستہ ہیں۔ آسٹریا میں پارٹی اور

مزدور سبھا دونوں کے مرکزی اور اہم کاموں کو سوشل ڈیموکریٹک کارکنان ہی انجام دیتے ہیں۔ اس سے اس کا کافی اندیشہ تھا کہ پارٹی کے اندر جو علیحدگی پسند رجحانات کام کر رہے ہیں ان کا اظہار اسی شد و مد سے مزدور سبھاؤں میں بھی ہوگا اور مزدور سبھائیں بھی ٹوٹنے لگیں گی۔ اور فی الحقیقت ایسا ہی ہوا بھی۔ قومیت کے اعتبار سے مزدور سبھائیں بھی منقسم ہو گئیں۔ اس وقت حالات اس حد کو پہنچ گئے ہیں کہ چیک مزدور جرمن مزدوروں کی اسٹرائیک تک توڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں، میونسپل کے چناؤ کے موقع پر وہ جرمن مزدوروں کے خلاف چیک سرمایہ داروں سے مل جاتے ہیں۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قومی خودمختاری قومی مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے، بلکہ اس سے مزدور طبقہ کی متحدہ تحریک میں انتشار اور پراگندگی پھیلتی ہے، ایک قوم کے مزدور دوسری قوم کے مزدور سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں، اور ان میں شدید تصادم ہونے لگتا ہے۔ اس طرح قومی مسئلہ اور بھی زیادہ پیچیدہ اور تشویشناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔

یہ قومی خودمختاری کا انجام ہے۔

۵۔ روس میں قومی مسئلہ

اب ہمیں قومی مسئلے کا صحیح حل پیش کرنا ہے۔

ہم اس دعوی کو مان کر آگے بڑھتے ہیں کہ اس مسئلے کو روس کی موجودہ صورت حال کے ضمن میں ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

روس اس وقت تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے۔ ابھی "سادھارن" "آئینی" زندگی قائم نہیں ہونے پائی اور سیاسی بحران دور ہوا ہے۔ ہلچل اور پیچیدگیوں کے دن آ رہے ہیں۔ اور اس سے موجودہ تحریک اور آنے والی تحریک دونوں کی بنیاد پڑی ہے جس کا مقصد کامل جمہوریت قائم کرنا ہے۔

قومی مسئلے کو اسی تحریک کی روشنی میں پرکھنا چاہئے۔

پس قومی مسئلے کو حل کرنے کی بنیاد اور اس کی ضروری شرط ملک میں مکمل جمہوریت قائم کرنا ہے۔ قومی مسئلے کا حل تلاش کرتے وقت ہمیں ملک کی اندرونی صورت حال کو ہی نہیں بلکہ بیرونی صورت حال کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔ روس، یورپ اور ایشیا، آسٹریا اور چین کے درمیان واقع ہے۔ اور ایشیا میں جمہوریت کی نشوونما لازمی ہے۔

یورپ میں سامراج کی نشوونما کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ یورپ میں سرمایہ لگانے کا

میدان بہت تنگ ہوتا جا رہا ہے، نئی منڈیاں، سستی محنت اور سرمایہ لگانے کے نئے موقعوں کی تلاش میں سرمایہ غیر ملکوں کی طرف پیر پھیلا رہا ہے۔ لیکن اس سے بیرونی (معاملات میں) پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور آخر میں جنگ ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جنگ بلقان سے ان پیچیدگیوں کا خاتمہ ہو گیا، آغاز نہیں ہوا؟ یہ بخوبی ممکن ہے کہ ایک وقت ایسے اندرونی اور بیرونی حالات پیدا ہو جائیں جس میں روس کی کوئی قوم اپنی آزادی کا سوال اٹھانا اور اسے طے کر لینا ضروری سمجھے۔ اور ظاہر ہے کہ مارکسیوں کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ اس قوم کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کریں۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روسی مارکسی قوموں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پس حق خود ارادیت قومی مسئلے کے حل کا ایک ضروری جزو ہے۔

لیکن پھر ان قوموں کے ساتھ ہمارا کیا رویہ ہو گا جو کسی نہ کسی وجہ سے مجموعی نظام کے اندر رہنا چاہتی ہوں؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قومی تہذیبی خود مختاری کسی کام کی چیز نہیں ہے۔

پہلی بات یہ کہ وہ ایک بناوٹی اور ناقابل عمل چیز ہے کیونکہ وہ مصنوعی طریقے سے ایسے لوگوں کو ملا کر ایک قوم بنانا چاہتی ہے جنہیں خود واقعات کی، جیتے جاگتے واقعات کی رفتار ایک دوسرے سے الگ، اور ملک کے کونے کونے میں منتشر کر رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے قوم پرستی کا جذبہ مضبوط ہوتا ہے، کیونکہ اس سے ایک ایسے خیال کی حمایت ہوتی ہے جو لوگوں کو ان کی قومی برادری کے مطابق "تقسیم" کرنا، قوموں کی "تنظیم کرنا"، قومی خصوصیتوں کا "تحفظ" اور ان کی نشوونما کرنا چاہتا ہے۔ سوشل ڈیموکریسی کو

ان چیزوں کا کوئی میل نہیں ہو سکتا۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ آسٹریا کی پارلیمنٹ میں موراویہ کے علیحدگی پسند نمائندوں نے جرمن سوشل ڈیموکریٹک نمائندوں سے قطع تعلق کر کے موراویہ کے سرمایہ دار نمائندوں سے اتحاد کر لیا ہے۔ اور اس طرح گویا موراویوں کا ایک "حلقہ" بنا لیا ہے۔ اور نہ یہ کوئی اتفاقی بات ہے کہ بند کے روسی علیحدگی پرست "سبت" اور "عبرانی" کا نعرہ بلند کر کے قوم پرستی کے جال میں پھنس گئے۔ دوما میں ابھی بند کا کوئی نمائندہ نہیں ہے، لیکن جس ضلع میں بند کا زور ہے وہاں یہودیوں کی ایک مذہبی رجعت پسند جماعت ہے۔ اور بند والے اس کوشش میں ہیں کہ اس کے "با اثر اداروں" کے ذریعہ یہودی مزدوروں اور سرمایہ داروں کو "ساتھ لے آئیں"۔ قومی تہذیبی خود مختاری کا یہ ایک منطقی نتیجہ ہے۔

غرضکہ "قومی" خود مختاری سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

مگر دوسرا راستہ کیا ہے؟

مسئلہ کا سچا حل صرف یہ ہے کہ علاقہ وار "خود مختاری دی جائے یعنی پولستان، لتھوانیہ، یوکرین، قفقاز جیسی واضح اور متعین وحدتوں کو خود مختاری عطا کی جائے۔

علاقہ وار خود مختاری میں کئی فائدے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس کا تعلق کسی من گھڑت چیز سے نہیں جس کا کہیں کوئی وطن نہ ہو بلکہ ایک خاص آبادی سے ہے جو ایک خاص علاقے میں آباد ہے۔

دوسرے، یہ لوگوں کو قومیت کی بنیاد پر تقسیم نہیں کرتی۔ اس سے قومی حدبندیاں مضبوط نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس کے برعکس، یہ ان دیواروں کو توڑ دیتی ہے۔ اور باشندوں کو اس ڈھنگ سے متحد کرتی ہے جس سے ایک نئی تقسیم کا یعنی ان کو طبقوں کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا راستہ کھل جاتا ہے۔

اور بالآخر، اس میں، اس علاقہ کی قدرتی دولت سے کام لینے اور پیداوار قوتوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے ترقی دینے کا پورا موقع ملتا ہے۔ اس کے لئے مشترکہ مرکز کے فیصلوں کا انتظار نہیں کرنا ہوتا۔ (اور یہ فیصلہ کرنا قومی تہذیبی خود مختاری کا کام نہیں ہے)

پس علاقہ وار خود مختاری، قومی مسئلے کے حل کا ایک ضروری جزو ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ان میں سے کوئی علاقہ ایسا نہیں جو ایک ہی گتھی ہوئی یک جنسی قوم پر مشتمل ہو۔ کیونکہ ہر ایک میں قومی اقلیتیں خلط ملط ہیں۔ مثلاً پولستان میں یہودی ہیں، تھوانیا میں لٹوی، قفقاز میں روسی، یوکرین میں پولستانی ہیں اور یہی حال دوسری جگہوں کا ہے۔ اس لئے اس بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے کہ کہیں ان ملکوں کی قومیں جو اکثریت میں ہیں اقلیتوں پر ظلم نہ کرنے لگیں۔ لیکن اس اندیشے کی بنیاد صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ ملک میں پرانا نظام بدستور قائم رہے۔ لیکن ملک میں کامل جمہوریت قائم کر دیجئے تو اس اندیشے کی بنیاد مٹ جائے گی۔

ایک تجویز یہ ہے کہ منتشر اقلیتوں کو ایک ہی قومی شیرازے میں متحد کر دیا جائے۔ لیکن اقلیتیں کوئی مصنوعی اتحاد نہیں چاہتیں۔ وہ تو یہ چاہتی ہیں کہ جس جگہ ان کی بود و باش ہے وہاں ان کو اصلی حقوق حاصل ہوں۔ مکمل جمہوریت کے بغیر انہیں اس قسم کے اتحاد سے کیا مل جائے گا؟ لیکن اس کے برخلاف، اگر مکمل جمہوریت قائم ہو جائے تو پھر اس قسم کے قومی اتحاد کی ضرورت ہی کیا رہ جائے گی؟

کسی قومی اقلیت کی بے چینی کا سبب کیا ہوتا ہے؟

کسی اقلیت میں بے چینی اس لئے نہیں پیدا ہوتی کہ اس کا قومی اتحاد باقی نہیں رہا بلکہ اس لئے کہ اسے اپنی مادری زبان کے استعمال کا حق نہیں دیا جاتا ہے۔ اسے اپنی مادری

زبان کے استعمال کا حق دے دیجئے تو اس کی بے چینی آپ ہی آپ رفع ہو جائے گی۔

اور کسی اقلیت میں بے چینی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ مصنوعی اتحاد قائم نہیں ہوا بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے اسکول نہیں کھول سکتی۔ ان کے اپنے اسکول قائم کر دیجئے تو بے چینی کی پوری بنیاد ختم ہو جائے گی۔

اقلیتوں کی بے چینی کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ انھیں ضمیر اور نقل و حرکت وغیرہ کی آزادی نہیں ہے۔ اسے یہ آزادیاں عطا کر دیجئے تو وہ فوراً مطمئن ہو جائے گی۔ چنانچہ زندگی کے تمام شعبوں (زبان، مدرسوں وغیرہ) میں قومی مساوات، قومی مسئلے کے حل کا ایک لازمی جزو ہے۔ مکمل جمہوریت کی بنیاد پر ملک میں ایک ایسے ریاستی قانون کی ضرورت ہے جو تمام قومی مراعات کو ممنوع قرار دے اور قومی اقلیتوں کے حقوق پر سے تمام رکاوٹیں اور پابندیاں دور کر دے۔

کسی اقلیت کے حقوق کی یہی ضمانت ہے۔ اور یہی ایک ایسی ضمانت ہے جو محض کاغذی نہیں۔

کوئی شخص مانے یا نہ مانے کہ تنظیمی وفاقیت[٢١] اور قومی تہذیبی خود مختاری میں ایک تعلق ہے۔ لیکن وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ قومی تہذیبی خود مختاری لامحدود وفاقیت

---

[٢١] تنظیمی وفاقیت کا اصول یہ ہو کہ کسی علاقے میں تمام مزدوروں کی ایک متحدہ تنظیم یا پارٹی نہ ہو۔ بلکہ ایک علاقے میں ہر قوم کے مزدوروں کی تنظیم الگ الگ ہو اور پھر اس طرح کی تمام تنظیموں کا ایک وفاق قائم کیا جائے۔ ہمارے یہاں اس کی صورت یہ ہوگی کہ جیسے جمشید پور میں ایک متحدہ مزدور یونین کے بدلے بنگالی مزدوروں کی الگ یونین ہو، پنجابیوں کی الگ ہو اور بہاری مزدوروں کی الگ۔

کے لئے مناسب ماحول پیدا کرتی ہے جو مکمل افتراق اور علیحدگی کی طرف لے جاتا ہے۔ آسٹریا میں، زیک اور روس میں بند والوں کا پہلا قدم خود مختاری تھا، پھر وفاق کی منزل آئی اور آخر میں انھوں نے علیحدگی پر آکے دم لیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں قوم پرست فضا کا بھی بڑا ہاتھ تھا اور قومی خود مختاری قدرتی طور پر ایسی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ قومی خود مختاری اور تنظیمی وفاقیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ دونوں قومیت کے مطابق تقسیم چاہتے ہیں۔ دونوں میں قومی بنیاد پر تنظیم کا اصول پنہاں ہے۔ دونوں کی ہم رنگی میں کلام نہیں ہو سکتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر ایک میں عام طور سے آبادی کو تقسیم کیا جاتا ہے تو دوسری صورت میں سوشل ڈیموکریٹک مزدوروں کو الگ الگ کر دیا جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ قومی بنیادوں پر مزدوروں کی تقسیم کا نتیجہ کیا ہو گا۔ مزدور طبقہ کی متحدہ پارٹی کا تتر بتر ہو جانا، قومی بنیادوں پر مزدور سبھاؤں کا الگ الگ ہو جانا، قومی اختلاف کا تیز ہو جانا، ایک قوم کے مزدوروں کے ہاتھوں دوسری قوم کے مزدوروں کی اسٹرائک کا توڑا جانا، سوشل ڈیموکریٹک تحریک کے اندر شکست خوردگی کا احساس پیدا ہونا —— یہی تنظیمی وفاقیت کے نتیجے ہیں۔ آسٹریا میں سوشل ڈیموکریسی کی تاریخ اور روس میں بند کی سرگرمیوں سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے۔

اس کا واحد علاج یہ ہے کہ بین الاقوامیت کی بنیاد پر تنظیم کی جائے۔

مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہر علاقے میں روس کی مختلف قوموں کے مزدوروں کو متحدہ اور سالم اجتماعی اداروں میں ایک ساتھ لے آیا جائے اور ان تمام اداروں کو ملا کر ایک پارٹی بنا دی جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر پارٹی کی بناوٹ اس طرح سے کی گئی تو خود مختاری کا خاتمہ نہیں ہو گا بلکہ اس کے برعکس یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس ایک سوچی پارٹی کے اندر وسیع پیمانے

پر علاقہ وار تو دھماری موجود ہے۔

قفقاز کے تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس قسم کی تنظیم بہت مفید ہے۔ اگر قفقاز والے ارمنیوں اور تاتاریوں کے جھگڑے ختم کرنے میں کامیاب ہوئے، اگر وہ لوگ یہاں کے باشندوں کو قتل و خونریزی سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئے، اگر باکو میں جہاں بھانت بھانت کی قومی جماعتیں بستی ہیں، اب قومی جھگڑوں کا کوئی امکان نہیں رہا اور تمام مزدوروں کو ایک ہی مضبوط تحریک کے دھارے میں کھینچ لانا ممکن ہو گیا ہے تو اس کامیابی میں قفقازی سوشل ڈیموکریسی کی بین الاقوامی بناوٹ کا ہاتھ کسی طرح کم نہیں۔

تنظیم کی نوعیت کا اثر صرف عملی کام تک ہی محدود نہیں۔ مزدوروں کی پوری ذہنی زندگی پر وہ ایک گہرا نقش چھوڑ دیتی ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔ مزدور اپنی تنظیم کی زندگی جینے لگتا ہے اور اسی سے اس کی ذہنی نشوونما اور تعلیم و تربیت میں مدد ملتی ہے۔ اور اس طرح مزدور جب اپنی تنظیم کے اندر زندگی بسر کرتا ہے، برابر دوسری قوموں کے ساتھیوں سے ملتا رہتا ہے، اور ان کے ساتھ مل کر ایک مشترک اجتماعی ادارے کی رہنمائی میں مشترک جدوجہد میں شریک ہوتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال گھر کر لیتا ہے کہ مزدور اصل میں ایک ہی طبقاتی خاندان کے رکن ہیں، وہ اشتراکیت کی ایک متحدہ فوج کے سپاہی ہیں۔ اور مزدور طبقے کی ایک بہت بڑی اکثریت کی تعلیم و تربیت میں اس کا زبردست اثر پڑتا ہے۔

غرضکہ بین الاقوامی طرز کی تنظیم ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں برادرانہ احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ اور بین الاقوامیت کے پرچار کا یہ ایک زبردست حربہ ہے۔

لیکن یہ خصوصیت کسی ایسی تنظیم میں نہیں پائی جاتی جو قومیت کی بنیاد پر قائم کی گئی ہو۔ مزدوروں کو جب قومیت کے مطابق منظم کیا جاتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے الگ اپنے اپنے قومی دڑبوں میں بند ہو جاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں بھی دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ زور اس بات پر نہیں دیا جاتا کہ مزدوروں میں کون سی چیز مشترک ہے۔ بلکہ اس بات پر کہ ان میں فرق کیا ہے۔ اس قسم کی تنظیم میں مزدور سب سے پہلے اپنی قوم کا ایک رکن ہوتا ہے۔ وہ یہودی، پولستانی وغیرہ کی حیثیت میں سامنے آتا ہے۔ اس لئے کوئی حیرت نہیں کہ تنظیم میں قومی وفاقیت کے اصول سے مزدوروں میں قومی علیحدگی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اور اس لئے قومی طرز کی تنظیم ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں تنگ نظری اور تعصب کی تعلیم دی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے سامنے تنظیم کی بنیادی طور پر دو مختلف شکلیں ہیں۔ ایک کی بنیاد بین الاقوامی اتحاد ہے اور دوسری، قومیت کے مطابق مزدوروں کی تنظیمی "تفریق" پر مبنی ہے۔ ان دونوں شکلوں میں موافقت پیدا کرنے کی کوششیں اب تک رائیگاں ہوتی رہی ہیں۔

آسٹریا کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے ویمبرگ میں ۱۸۹۷ء میں مصالحت کے جو قاعدے بنائے تھے وہ بے اثر ثابت ہوئے۔ آسٹریا کی پارٹی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور اپنے ساتھ مزدور سبھاؤں کو بھی لیتی گئی۔ "سمجھوتے" کی تمام کوششیں صرف خیالی ہی نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ثابت ہوئیں۔ اسٹریسر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "علیحدگی پرستی کے اصول کی پہلی جیت ویمبرگ پارٹی کانگریس میں ہوئی"۔

روس پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ اسٹاک ہوم کانگریس[۳۲] کے موقع پر بند

---

۳۲ — اس سے مراد روسی سوشل ڈیموکریٹک مزدور پارٹی کی چوتھی کانگریس ہے جسے "میل ملاپ کی کانگریس" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۰۶ء میں اسٹاک ہوم میں منعقد ہوئی تھی۔ چونکہ بالشویک [illegible]

ی وفاقیت سے جو "سمجھوتہ" ہوا تھا اس کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بند نے اسٹاک ہولم کے سمجھوتے کی خلاف ورزی کی۔ اسٹاک ہوم کانگرس کے بعد سے بند ایک ایسی تنظیم کی راہ میں سخت رکاوٹ بن گئی ہے جس میں مختلف مقاموں پر تمام قوموں کے مزدوروں کو شامل اور متحد کیا جا سکے۔ بند کو برابر اپنی علیحدگی پسند ترکیبوں پر اصرار رہا ہے باوجود اس کے کہ سنہ ۱۹۰۶ء اور پھر سنہ ۱۹۰۸ء میں روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی نے بار بار یہ مطالبہ کیا کہ تمام قوموں کے مزدوروں میں نیچے سے اتحاد قائم کیا جائے۔ بند نے پہلا قدم تنظیمی قومی خودمختاری کا اٹھایا تھا، پھر وہ وفاقیت پر پہونچی اور اب اس نے مکمل علیحدگی اور تفریق پر آگے قدم لیا ہے۔ اور روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے قطع تعلق کر کے اس نے پارٹی کے اندر اختلاف اور بدنظمی کا بیج بو دیا۔ مثال کے طور پر ہم جگیلو والے واقعہ کا ذکر کر سکتے ہیں۔[23]

لہٰذا سمجھوتے "کا راستہ ترک کر دینا چاہیے کہ وہ ایک ناقابل عمل خیالی اور مہلک راستہ ہے۔

(بسلسلہ صفحہ ۳۰) کی اکثر کمیٹیاں پولیس کے ظلم کا شکار ہو گئی تھیں اس لئے اس کانگرس میں منشویک اکثریت میں تھے۔ بند کے تین نمائندے بھی شریک ہوئے۔ لیکن کانگرس نے قومی مسئلے پر کوئی فیصلہ کن تجویز پاس نہیں کی بلکہ مسئلہ کو اگلی کانگرس پر اٹھا رکھا۔ لیکن سمجھوتہ یہ تھا کہ اگلی کانگرس سے پہلے بند خود اپنے پروگرام میں ضروری رد و بدل کرے گی۔

۲۳ ۔ جگیلو، پولستانی سوشلسٹ پارٹی کے انتہا پسند گروہ کا رکن تھا اور روس کی چوتھی دوما (پارلیمنٹ) میں وارسا سے منتخب ہوا تھا کیونکہ اس وقت وارسا سمیت پولستان، سلطنت روس کا حصہ تھا۔ پولستانی سوشلسٹ پارٹی صرف نام میں سوشلسٹ اور سوشل ڈیموکریٹک سے دور پارٹی ہے (باقی صفحہ ۴۰ پر)

دو میں سے ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ یا تو بند کی وفاقیت ہو اور اس صورت میں روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو نئے سرے سے اپنی تنظیم کرنی ہوگی، قومیت کے مطابق مزدوروں کو "الگ الگ" کرنا ہوگا۔ اور یا بین الاقوامی طرز کی تنظیم ہو، اور اس صورت میں بند کو نئے سرے سے علاقہ وار خودمختاری کی بنیاد پر اپنی تنظیم کرنی ہوگی جیسا کہ قفقاز، لٹویا اور پولستان میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی تنظیم کی گئی ہے۔ اور اسی طرح یہودی مزدوروں کو روس کی دوسری قوموں کے مزدوروں کے براہ راست متحد کرنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

اس کے سوا کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے۔ اصولوں کی فتح ہوا کرتی ہے، ان میں "سمجھوتہ" نہیں ہوتا۔ پس مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کا اصول قومی مسئلے کے حل کا ایک ضروری جزو ہے۔

ویانا۔ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء

(بسلسلہ صفحہ ۳۹) مختلف اور اس کی مخالف تھی۔ جگیلو کو منتخب کرانے کے لئے بند والے اور پولستانی سوشلسٹ پارٹی یہودی سرمایہ دار قوم پرستوں سے مل گئی۔ مزدوروں کے انتخابی حلقہ میں سوشل ڈیموکریٹ مزدوروں کی اکثریت تھی اور وہ جگیلو کے خلاف تھے مگر اس کے باوجود جگیلو اپنے یہودی سرمایہ داروں کی مدد سے منتخب ہو گیا۔ دوما میں سوشل ڈیموکریٹ نمائندوں کی جو جماعت تھی اس میں منشویکوں کی اکثریت تھی۔ انھوں نے بڑی خوشی سے مزدوروں کے اس دھوکہ باز دشمن کو اپنے اندر شامل کر لیا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ بند نے اور پولستانی سوشلسٹ پارٹی نے پولستان کے مزدوروں میں پھوٹ ڈالنے کی جو ترکیب اختیار کی تھی اس کو منشویکوں نے قبولیت کی سند عطا کی۔

قومی مسئلے کے سلسلے میں پارٹی کے فوری فرائض

(یہ مقالہ مرکزی کمیٹی کی منظوری سے روسی کمیونسٹ پارٹی کی دسویں کانگریس میں پیش کیا گیا تھا)

(سن ۱۹۲۱ء)

۱- سرمایہ داری نظام اور قومی جبر و تشدد

۱- موجودہ قومیں ایک خاص دور یعنی ابھرتی ہوئی سرمایہ داری کے دور کی پیداوار ہیں۔ جاگیری نظام کے مٹنے اور سرمایہ داری کی نشو و نما کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ لوگ، قوم کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے جس زمانے میں سرمایہ داری کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی اور جاگیری نظام پر فتح حاصل کر رہی تھی اسی زمانے میں انگریز، فرانسیسی، جرمن اور طالوی لوگوں کی قومیں بنیں۔

۲- جہاں قوموں کے بننے کے ساتھ ساتھ ایک ہی وقت میں مرکزی ریاستیں بھی بنیں، وہاں قوموں نے قدرتی طور پر ریاست کا جامہ پہن لیا اور وہ ترقی کر کے آزاد سرمایہ دار قومی ریاستیں بن گئیں۔ چنانچہ برطانیہ (آئرستان کو چھوڑ کر)، فرانس

اور اطالیہ میں یہی صورت ہوئی۔ اس کے برعکس مشرقی یورپ میں (ترک اور منگول حملہ آوروں سے) اپنی حفاظت کرنے کی ضرورت تھی۔ اس وجہ سے مرکزی حکومت کی تعمیر زیادہ تیزی سے ہونے لگی اور جاگیریت کے زوال اور قوموں کے بننے سے پہلے ہی مکمل ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں قوموں نے ترقی کر کے قومی ریاست کی شکل اختیار نہیں کی۔ یہ ممکن ہی نہ تھا بلکہ یہاں کئی ملی جلی، کثیر الاقوام سرمایہ دار ریاستیں قائم ہو گئیں جن میں عام طور سے ایک مضبوط، غالب قوم اور کئی کمزور ماتحت قومیں شامل تھیں۔ آسٹریا، ہنگری، اور روس اسی قسم کی ریاستیں ہیں۔

۳- قومی ریاستیں مثلاً فرانس اور اطالیہ جن کا دار و مدار ابتدا میں اپنی ہی قومی قوتوں پر تھا، عام طور سے قومی جبر و تشدد سے ناآشنا رہیں۔ اس کے برعکس کثیر الاقوام ریاستیں، قومی جبر و تشدد اور قومی تحریکوں کی پیدائش کی جگہ اور ان کا خاص مرکز تھیں کیونکہ ان کی بنیاد دوسری قوموں پر ایک قوم یا یوں کہئے کہ اس کے حکمراں طبقے کے تسلط پر رکھی گئی تھی حکمراں اور محکوم قوموں کے مفاد میں تضاد اتنا گہرا ہے کہ اگر انہیں حل نہ کیا گیا تو کثیر الاقوام ریاستوں کا مضبوطی سے قائم رہنا ناممکن ہے۔ کثیر الاقوام سرمایہ دار ریاست کی بدبختی یہی ہے کہ وہ ان تضادوں پر قابو نہیں پا سکتی۔ ذاتی ملکیت اور طبقاتی نابرابری کو قائم رکھتے ہوئے قوموں کو "ایک سطح پر لانے" اور قومی اقلیتوں کی "حفاظت" کرنے کی کوششیں عموماً ہر بار ناکام رہتی ہیں۔ اور اس سے قومی دشمنی اور زور پکڑتی ہے۔

۴- یورپ میں سرمایہ داری کی مزید ترقی، نئی منڈیوں کی ضرورت، کچے مال اور تیل اور کوئلے کی تلاش اور بالآخر سامراجیت کی نشو و نما، سرمایہ کی برآمد، بڑے بڑے بحری اور ریل کے راستوں کی حفاظت کرنے کی ضرورت کا نتیجہ ایک تو یہ ہوا کہ پرانی قومی ریاستو

نے نئے علاقوں پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ اور وہ بدل کر کثیر الاقوام (نو آبادی رکھنے والی) ریاستیں بن گئیں اور ان کے یہاں بھی قومی مظالم اور قومی جھگڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو کثیر الاقوام ریاستوں کا قدرتی خاصہ ہے۔ (برطانیہ، فرانس، جرمنی، اطالیہ اس کی مثالیں ہیں) دوسری طرف پرانی کثیر الاقوام ریاستوں کی حکمراں قومیں زیادہ شدت سے کوشش کرنے لگیں کہ پرانی ریاستی سرحدوں کو صرف قائم ہی نہیں رکھا جائے بلکہ انھیں بڑھایا جائے اور ہمسایہ ریاستوں میں نئی (کمزور) قوموں کو غلام بنا لیا جائے۔ اس طرح قومی مسئلہ پھیلتا گیا اور بالآخر خود واقعات کے بہاؤ میں پڑ کر نو آبادیوں کے عام مسئلے میں مل گیا۔ قومی جبر و تشدد اب کوئی اندرونی مسئلہ نہیں رہا بلکہ ریاستوں کے باہمی تعلق کا "بڑی" سامراجی حکومتوں کے مابین جھگڑے (اور جنگ) کا مسئلہ بن گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کمزور اور بے اختیار قوموں کو محکوم بنا لیا جائے۔

(۵) سامراجی جنگ نے قومی تضاد اور سرمایہ دار قومی ریاستوں کے کھوکھلے پن کو اچھی طرح ثابت کر دیا۔ فاتح اور نو آبادیوں کی مالک ریاستوں (برطانیہ، فرانس، اطالیہ) میں آپس میں بہت شدید جھگڑے ہونے لگے، پچھلے کی کثیر الاقوام ریاستیں شکست کھا کر بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں (آسٹریا، ہنگری اور روس شاہی) اور نئی سرمایہ دار قومی ریاستیں (پولستان، زیکوسلاویکیہ، یوگوسلاویہ، فن لینڈ، جارجیا، آرمینیا وغیرہ) قائم ہو گئیں۔ سرمایہ داروں کے نزدیک یہی قومی مسئلے کا سب سے زیادہ "بنیادی" حل تھا۔ لیکن نئی آزاد قومی ریاستیں قائم ہونے کا نتیجہ یہ نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا کہ قومیں آپس میں امن اور صلح کی زندگی بسر کریں، اس سے قومی نابرابری یا قومی مظالم ختم نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے تھے کیونکہ نئی قومی ریاستیں ذاتی ملکیت اور طبقاتی نابرابری پر مبنی ہیں اور اس لئے ان کو

لئے یہ ناممکن ہے کہ (۱) خود اپنی قومی اقلیتوں پر ظلم نہ کریں (پولستان یوں، سفید روسیوں، یہودیوں، لتھوانیوں اور یوکرینیوں پر ظلم کرتا ہے۔ جارجیا میں استرئی، ابخاشی اور ارمنی اقلیتوں پر ظلم کیا جاتا ہے۔ یوگوسلاویہ میں کروٹ اور بوسنی وغیرہ اقلیتوں پر ظلم ہوتا ہے)، (۲) اپنے ہمسایہ کے علاقے پر قبضہ کر کے اپنی سرحد کو وسیع نہ کریں، جس کی بدولت جھگڑے اور جنگیں ہوتی ہیں (لتھوانیہ، یوکرین اور روس کے خلاف پولستان، بلغاریہ کے خلاف یوگوسلاویہ، آرمینیہ اور ترکی کے خلاف جارجیا وغیرہ کی کوششیں) اور (۳) مالیاتی، معاشی اور فوجی اعتبار سے "بڑی" سامراجی طاقتوں کے زیر اثر نہ آ جائیں۔

۶۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ ایک افسوس ناک تصویر پیش کرتا ہے جس میں مہذب ملکوں کی قومیں ایک دوسرے کے ساتھ اور بے اختیار قوموں کے ساتھ قومی دشمنی، نابرابری، ظلم، جھگڑے، جنگ اور سامراجی درندگی کا اظہار کرتی ہیں۔ ایک طرف چند "بڑی" حکومتیں ہیں جو ماتحت قوموں اور "آزاد" (مگر حقیقت میں بالکل محکوم) قومی ریاستوں پر ظلم کرتی ہیں اور ان کا استحصال کرتی ہیں اور قومی ریاستوں کو لوٹنے کی اجارہ داری کے لئے آپس میں جدوجہد کرتی ہیں۔ اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قومی ریاستیں خواہ محکوم ہوں یا "آزاد" "بڑی" حکومتوں کے ناقابل برداشت مظالم کے خلاف جدوجہد کرتی ہیں، پھر یہ قومی ریاستیں اپنا قومی علاقہ بڑھانے کے لئے آپس میں جدوجہد کرتی ہیں۔ اور ہر قومی ریاست خود اپنی مظلوم قومی اقلیت کے خلاف جدوجہد کرتی ہے۔ نو آبادیوں میں "بڑی" حکومتوں کے خلاف آزادی کی تحریک بڑھتی ہے۔ ان حکومتوں کے اندر اور قومی ریاستوں کے اندر بھی، جن میں عام طور سے کئی قومی اقلیتیں شامل ہیں، قومی جھگڑے زور پکڑنے لگتے ہیں۔ سامراجی جنگ دنیا

کی یہی تصویر" چھوڑ گئی ہے۔

مختصر یہ کہ قومی مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں سرمایہ دار سماج بالکل ہی دیوالیہ ثابت ہوا ہے۔

سوویت نظام اور قومی آزادی

۱۔ اگر ذاتی ملکیت اور سرمایہ لازمی طور سے لوگوں میں اختلاف کا بیج بوتا، قومی دشمنی کے شعلے بھڑکاتا اور قومی جبر و تشدد کو تیز کرتا ہے تو اجتماعی ملکیت اور محنت اسی قدر لازمی طور پر لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی اور قومی جبر و تشدد کی جڑیں کھوکھلی کرتی ہے۔ سرمایہ داری رہے اور قومی جبر و تشدد ختم ہو جائے یہ چیز تصور میں نہیں آسکتی اسی طرح جیسے یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اشتراکیت قائم ہو اور مظلوم قوموں کو آزادی نہ ملے، قومی آزادی نہ قائم ہو۔ جنگجو قوم پرستی اور قومی جھگڑے اس وقت تک ناگزیر ہیں، جب تک کہ کسانوں (اور بالعموم متوسط طبقے کے لوگوں) میں قومی تعصب سرایت کئے ہوئے ہے اور وہ سرمایہ داروں کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس کسان جب مزدور طبقے کی پیروی کرنے لگیں یعنی جب مزدور طبقے کی آمریت[۲۲] قائم ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ قومی امن اور

۲۲۔ آمریت یا ڈکٹیٹر شپ کسی فرد یا جماعت کی مطلق العنان حکومت کو کہتے ہیں جو تشدد پر مبنی ہو۔ لیکن سچ پوچھئے تو دنیا کی ہر حکومت آج بھی اور آج سے پہلے بھی ہمیشہ ایک آمریت رہی ہے۔ حکومت ہمیشہ کسی نہ کسی طبقے کی حکومت ہوتی ہے خواہ وہ پارلیمانی ملکوں کی طرح جمہوریت کے پردے کے اندر ہو یا شیر کی طرح برہنہ تلوار لے کر سامنے آجائے۔ اور حکومت ہمیشہ تشدد پر مبنی ہوتی ہے (باقی صفحہ ۸۲ پر)

قومی آزادی قائم ہوگئی۔ اس لئے قومی جبر و تشدد کو مٹانے اور قومی برابری قائم کرنے کی بنیادی شرط اور قومی اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت یہ ہے کہ سوویتوں کو فتح ہو اور مزدور طبقے کی آمریت قائم ہو۔

۲۔ سوویت انقلاب کے تجربے سے اس دعوے کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔ روس میں سوویت نظام قائم ہو جانے اور قوموں کی سیاسی علیحدگی کے حق کے اعلان کی وجہ سے روس کی تمام قوموں کے محنت کش عوام کے باہمی تعلقات میں بہت بڑی تبدیلی ہوگئی ہے۔ پرانی قومی دشمنی کی دیواریں ہل گئی ہیں، قومی جبر و تشدد کی بنیاد ختم ہو چکی ہے، روسی مزدوروں کو صرف روس ہی میں نہیں بلکہ تمام یورپ اور ایشیا میں دوسری قوموں کے مزدور بھائیوں کا اعتماد حاصل ہوگیا اور یہ اعتماد بڑھ کر جوش و خروش کے اس درجے پر پہونچ گیا ہے کہ آج وہ ایک مشترکہ مقصد کے لئے ساتھ مل کر لڑنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ آذربائیجان اور آرمینیہ میں سوویت جمہوریتیں قائم ہونے کا نتیجہ بھی یہی ہوا، قومی جھگڑوں اور

(بسلسلہ صفحہ ۱۸) کیونکہ اس کے بغیر ایک طبقہ دوسرے طبقے کو اپنا محکوم نہیں بنا سکتا۔ لیکن آمریت آمریت میں فرق ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ سرمایہ داروں کی آمریت میں گنتی کے چند سرمایہ دار ملک کے بے شمار باشندوں کو دباتے اور ان پر ظلم کرتے ہیں۔ مگر مزدور طبقے کی آمریت میں محنت مزدوری کرکے پیٹ پالنے والی مخلوق زمینداروں اور سرمایہ داروں کو دباتی اور ان سے ظلم کا ہتھیار چھین لیتی ہے۔ مزدور طبقے کی آمریت انسانی تاریخ میں پہلی حکومت ہے جو صحیح معنی میں عوام الناس کی جمہوریت اور ان کی آزادی کا پیام بر ہے۔ لیکن مزدور طبقے کی آمریت صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے جب کسانوں کی اکثریت مزدوروں کے ساتھ ہو جائے۔ جب بے شمار کسان، مزدور طبقے کی پیروی کرنے لگیں۔ صرف اسی صورت میں زمیندار اور سرمایہ دار طبقے کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔

ترکی اور گرجی محنت کشوں اور ارمنی اور آذربائیجانی محنت کشوں کی صدیوں پرانی "دشمنی" کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ ہنگری، ویریا، فن لینڈ اور لیٹویا میں سوویتوں کی عارضی کامیابی کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ملک کے اندر قومی دشمنی اور قومی جبر و تشدد کا خاتمہ نہ کر دیا جاتا اور اگر مغرب و مشرق کے محنت کش عوام کا اعتماد اور ان کی پرجوش حمایت حاصل نہ ہوتی تو روسی مزدور کولچک اور دینکن کو شکست دے سکتے تھے اور نہ آذربائیجان اور آرمینیہ کی جمہوری ریاستیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی تھیں۔ غرضکہ سوویت جمہوریتوں کا استحکام اور قومی جبر و تشدد کا خاتمہ اسی ایک عمل کے دو پہلو ہیں جو محنت کشوں کو سامراجی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔

۳۔ لیکن کوئی سوویت جمہوریت خواہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، اس کا وجود سامراجیت کے لئے ایک مہلک خطرہ ہے۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں کہ سوویت جمہوریتوں نے سامراجیت کا بندھن توڑ دیا ہے اور غلامی اور نیم غلامی کی حالت سے نکل کر فی الواقع آزاد ریاستوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اس طرح سامراجیوں کو ان کے بعض علاقوں اور آمدنیوں سے محروم کر دیا گیا ہے، بلکہ اس کا دوسرا اور اصل سبب یہ ہے کہ سوویت جمہوریتوں کا محض قائم رہنا ہی، اور سرمایہ دار طبقے کو مٹانے اور مزدور طبقے کی آمریت کو مستحکم کرنے کے لئے ان جمہوریتوں کا ایک ایک قدم، سرمایہ داری اور سامراجیت کے خلاف زبردست جدوجہد ہے، محکوم ملکوں کو سامراجی بندھن سے نجات دلانے کی تحریک ہے، اور بہر صورت سرمایہ داری کے اندر ابتری اور بدنظمی پھیلانے کا زبردست حربہ ہے۔ اس لئے لازمی بات ہے کہ "بڑی" سامراجی طاقتیں سوویت جمہوریتوں کے خلاف جدوجہد کریں گی، ان جمہوریتوں کو مٹا دینے کے لئے پورا زور لگا دیں گی۔ سوویت روس کے خلاف جدوجہد کرنے میں

"بڑی بڑی" سامراجی طاقتیں یکے بعد دیگرے سرحد کی ہر سرمایہ دار حکومت کی، اور انقلاب دشمن فوجی جنرلوں کو ابھار رہی ہیں، اس ملک کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر رہی ہیں اور عام طور سے اس کوشش میں ہیں کہ اس ملک کو معاشی اعتبار سے بالکل بے یار و مددگار بنا دیا جائے۔

اس جدوجہد کی تاریخ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ موجودہ بین الاقوامی حالات میں سوویت جمہوریتیں سرمایہ داروں کے نرغے میں گھری ہوئی ہیں اور کسی سوویت جمہوریت کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ تن تنہا وہ عالمگیر سامراجیت کی لائی ہوئی معاشی خستہ حالی اور فوجی تباہی سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

۴۔ غرضکہ تنہا رہنے میں سوویت جمہوریتوں کی زندگی غیر محفوظ ہے کیونکہ ان کے اوپر سرمایہ دار ریاستوں کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ حفاظتِ وطن کے معاملہ میں سوویت جمہوریتوں کا مفاد ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ دوسری بات یہ کہ پیداآوری قوتیں جو جنگ کے زمانے میں برباد ہو گئی تھیں انھیں نئے سرے سے قائم کرنا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ جن سوویت جمہوریتوں میں غذا کی بہتات ہے انھیں ان سوویت جمہوریتوں کی مدد کرنا ہے جہاں غذا کی کمی ہے۔ ان تمام باتوں کا لازمی تقاضہ ہے کہ مختلف سوویت جمہوریتیں سیاسی اتحاد قائم کریں کیونکہ سامراجی غلامی اور قومی جبر و تشدد سے بچے رہنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ خود "اپنے" اور "غیر ملکی" سرمایہ داروں سے آزاد ہو جانے کے بعد قومی سوویت جمہوریتیں اگر ایک مضبوط سیاسی وحدت میں مل جائیں تو اپنی ہستی کا تحفظ کر سکتی ہیں اور سامراجیت کی متحدہ قوتوں کو شکست دے سکتی ہیں، ورنہ نہیں۔

۵۔ سوویت جمہوریتوں کا ایک وفاق جس کی بنیاد مشترکہ فوجی اور معاشی مسئلوں پر ہو سیاسی اتحاد کی ایک ایسی عام صورت ہے جس میں یہ ممکن ہے کہ (الف) الگ الگ ہر جمہوریت کی اور پھر پورے وفاق کی سالمیت اور ان کی معاشی ترقی کا یقینی انتظام کیا جا سکے، (ب) مختلف قوموں اور لوگوں کی مختلف سماجی، تہذیبی اور معاشی حالتوں کو، جو ابھی نشو و نما کے مختلف مرحلوں میں ہیں، پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہر ایک کے ساتھ وفاق کی وہی صورت اختیار کی جائے جو اس کے مناسب حال ہو، (ج) وہ قومیں اور لوگ جو کسی نہ کسی شکل میں وفاق میں شریک ہیں ایک دوسرے کے ساتھ امن چین سے رہیں اور برادرانہ تعاون کریں۔ روس نے وفاق کی مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ ایک طرف وفاق کی بنیاد سوویت خودمختاری کے اصول پر ہے (کرغیز جمہوریہ، باشقیر جمہوریہ، تاتار جمہوریہ، عز تری، داغستان) دوسری طرف وفاق کی بنیاد آزاد سوویت جمہوریتوں (یوکرین، آذربائیجان) کے باہمی معاہدوں پر ہے اور پھر درمیانی صورتیں (ترکستان، سفید روس) ہیں۔ اس تجربہ سے اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ وفاق ہی سوویت جمہوریتوں کے سیاسی اتحاد کی ایک عام صورت ہے جس میں حسبِ ضرورت، حالات کے مطابق ہیر پھیر کیا جا سکتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔

۶۔ لیکن وفاق اسی صورت میں پائیدار ہو سکتا ہے اور اس سے حقیقی نتیجے حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ وفاق کی بنیاد باہمی اعتماد پر ہو اور وفاق میں شامل ہونے والے ملک اپنی رضا و رغبت سے شریک ہوں۔ "روسی اشتراکی وفاقی سوویت جمہوریت" دنیا میں اکیلا ملک ہے جہاں یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا ہے، جہاں بہت سی قومیں اور لوگ امن چین سے ایک ساتھ زندگی بسر کرتے اور آپس میں برادرانہ تعاون کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں نہ حکمراں قومیں ہیں، نہ محکوم قومیں، نہ تو "مادرِ وطن" [45] ہے اور نہ نوآبادیاں، نہ سامراجیت ہے اور نہ قومی جبر و تشدد۔

---

[45] ایک سامراجی ملک، اپنی نوآبادیوں کے مقابلہ میں "مادرِ وطن" بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ کے مقابلہ میں انگلستان "مادرِ وطن" ہے۔

اس ملک میں وفاق کا دارومدار مختلف قوموں کے محنت کش عوام کے باہمی اعتماد اور اپنی رضامندی سے متحد ہونے کی خواہش پر ہے۔ وفاق کی اس رضامندانہ نوعیت کو مستقبل میں بھی پوری طرح قائم رکھنا چاہئے کیونکہ اس قسم کا وفاق ہی اس زینے کا کام دے سکتا ہے جس سے گزر کر تمام ملکوں کے محنت کشوں کو ایک ہی عالمگیر معاشی نظام میں پوری طرح متحد کیا جا سکتا ہے جس کی ضرورت دن بدن بڑھتی اور زیادہ محسوس ہوتی جا رہی ہے۔

روسی کمیونسٹ پارٹی کے فوری فرائض

روسی اشتراکی وفاقی سویت جمہوریت" اور اس کی ساتھی سویت جمہوریتیں تقریباً چودہ کروڑ انسانوں کی نمائندہ ہیں۔ ان میں ساڑھے چھ کروڑ غیر روسی قوموں کے لوگ ہیں اور کرینی، سفید روسی، کرغیز، ازبک، ترکمان، تاجک، آذربائیجانی، وولگا کے تاتار، کریمیا کے تاتار، بخارا، خیوا کے باشندے، باشقر، آرمینی، چیچن، کبارڈی، استزنی، سرکاشی، انگوشی، قراچائی، بلغاری[22]، کالموک، کاریلی، آدیری، وارغی، قاضی کوغی، کرین، کومایک[23]، ماری، چوواش، ووتس، وولگا کے جرمن، بریات، یاقوتی وغیرہ۔ ان لوگوں کے متعلق زاریت اور زمیندار اور سرمایہ داروں کی پالیسی یہ تھی کہ ان میں اگر اپنی ریاست قائم کرنے کے خیال کا شائبہ بھی پایا جائے تو اسے فنا کر دیا جائے، ان کی تہذیب کو پامال کر دیا جائے، ان کی مادری زبان کے استعمال پر پابندیاں لگائی جائیں، انھیں جہالت کی حالت میں رکھا جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان پر روسی رنگ چڑھا دیا جائے۔ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ ترقی کے لحاظ سے نہایت ادنی حالت میں اور سیاسی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔

---

[22] چیچن، کبارڈی، استزنی، سرکاشی، انگوش، قراچائی، بلغاری لوگوں سے مل کر غرزی گروہ بنتا ہے۔

[23] آدیری، وارغی، قاضی کوغی، کرین، کومایک لوگوں سے مل کر داغستانی گروہ بنتا ہے۔

لیکن اب کہ ان ملکوں کے عوام نے زمینداروں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کر دیا اور ایک سوویت حکومت قائم کر لی ہے، کمیونسٹ پارٹی کا فرض ہے کہ ان غیر روسی قوموں کے محنت کشوں کو مرکزی روس کی سطح پر پہنچنے میں مدد کرے، جو ان سے بہت آگے ہے۔ پارٹی کو ان کی مدد کرنی چاہیے تاکہ (الف) وہ خود اپنے سوویت ریاستی نظام کو ایسی شکل میں ترقی دیں اور مضبوط بنائیں جو ان لوگوں کے قومی کردار سے مناسبت رکھتی ہو (ب) وہ اپنی عدالتیں، اپنے انتظامی شعبے، اپنے حکومتی اور معاشی ادارے قائم کر سکیں جن میں ان کی مادری زبان میں کام ہو، اور کارندے مقامی باشندوں میں سے بھرتی کیے جائیں جو مقامی آبادی کے رسم و رواج اور نفسیات سے واقف ہوں۔ اور (ج) وہ اپنے اخبار، مدرسے، تھیٹر، کلب، اور تفریحی اور تعلیمی ادارے قائم کر سکیں اور یہاں بھی ان کی مادری زبان استعمال کی جائے۔

۲۔ اس ساڑھے چھ کروڑ کی غیر روسی آبادی میں سے اگر یوکرین، سفید روس، آرمینیہ اور آذربائیجان کے ایک چھوٹے سے حصے کو الگ کر دیا جائے جو صنعتی سرمایہ داری کے دور سے گزر چکے ہیں تو تین کروڑ لوگ باقی رہتے ہیں جو بیشتر ترکی النسل ہیں (ترکستان، آذربائیجان کا بڑا حصہ، داغستان، غرزنی، تاتار، باشقر، کرغیز وغیرہ) سرمایہ دارانہ نشو و نما کا دور ابھی ان پر نہیں گزرا۔ ان کے یہاں اپنا صنعتی مزدور طبقہ بالکل یا قریب قریب نہیں ہے۔ اکثر صورتوں میں وہ گلہ بانی کرتے اور آبوی[۲۸] قبیلوں کی زندگی بسر کرتے ہیں (جیسے کرغیزیہ، باشقیریہ، شمالی قفقاز)، یا ابھی تک پرانے نیم آبوی، نیم جاگیری طرز کی

[۲۸] آبوی لفظ اب سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں باپ۔ آبوی نظام سے مراد سماجی زندگی کی وہ حالت ہے جس میں انسان قبیلوں میں رہتے ہیں۔ ان میں آپس میں غلام اور آقا، کسان اور زمیندار وغیرہ (باقی صفحہ ۴۹ پر)

زندگی سے آگے نہیں بڑھے (آذربائیجان، کریمیا وغیرہ) پھر بھی وہ سوویت نشو و نما کے مشترکہ دھارے میں کھینچ آئے ہیں۔

ان لوگوں کے محنت کش عوام کے سلسلہ میں پارٹی کا فرض (پیراہ اول میں کچھ کہا گیا اس کے علاوہ) یہ ہے کہ ان کی اس طرح مدد کرے کہ وہ آبوی جاگیری تعلقات کے بچے کھچے اثرات کو مٹا سکیں اور محنت کش کسانوں کی سوویتوں کی بنیاد پر ایک سوویت سماجی نظام کی تعمیر میں ہاتھ بٹا سکیں۔ اس کے لئے ان لوگوں میں مضبوط کمیونسٹ تنظیمیں قائم کی جائیں جن میں یہ صلاحیت ہو کہ سوویتی اور معاشی نشو و نما میں روسی مزدوروں اور کسانوں کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں اور پھر اتنی سمجھ بھی ہو کہ وسطی روس کی معاشی تدبیروں کو آنکھ بند کر کے اختیار نہ کریں کیونکہ ان کا تعلق معاشی نشو و نما کی ایک مختلف اور اونچی منزل سے ہے۔ بلکہ اس کے بجائے اپنے تعمیری کاموں کو ہر جگہ کے مقامی لوگوں کی مخصوص معاشی حالتوں، طبقاتی بناوٹ، تہذیب اور عادتوں کی روشنی میں ہیر پھیر کر کے اسی ڈھب پر لائیں۔

(۳) اگر ان تین کروڑ انسانوں میں سے جو بیشتر ترکی النسل ہیں، ہم آذربائیجان، ترکستان کا ایک بڑا حصہ، وولگا اور کریمیا کی تاتار جمہوریتیں، بخارا، خیوا، داغستان، غرزنی کا ایک حصہ (کبارڈی، سرکاشی، بلقاری) اور کچھ اور لوگوں کو جنھوں نے اب سکونت اختیار کر لی ہے

(بقیہ صفحہ ۴۸) کے اقتصادی اور سیاسی تعلقات یا تو قائم نہیں ہوئے یا زیادہ ترقی کرنے نہیں پائے۔ سب سے قریبی رشتہ خون کا رشتہ ہوتا ہے یعنی یہ کہ سب ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں۔ اور باپ ہی خاندان یا قبیلے کا سردار ہوتا ہے۔ یہ حالت عام طور سے انسانی ارتقا کی بہت ابتدائی منزلوں میں پائی جاتی ہے جب کہ انسان ابھی گلہ بانی کے دور سے آگے بڑھنے نہیں پایا تھا۔

اور ایک خاص علاقہ میں مستقل بس گئے ہیں، الگ کر لیں تو ایک کرور کرغیز، باشقیر، چیچن، استرئی اور انگوش باقی رہ جاتے ہیں۔ چند سال پہلے تک روس والے ان کی زمینوں پر آ آ کر اپنی نو آبادیاں قائم کرتے تھے۔ انھوں نے ان کی سب سے زرخیز زمینوں پر قبضہ کر کے ان کو بے آب و گیاہ ریگستان کی طرف دھکیل دیا تھا۔ زاریت اور زمینداروں اور سرمایہ داروں کی پالیسی یہ تھی کہ روسی کسانوں اور قازقوں میں سے کولاکوں[29] کو چن چن کر اس علاقے میں آباد کر دیا جائے تاکہ ایک قابل اعتبار طبقہ پیدا ہو جائے جس کی بنیاد پر وہ اپنے حاکمانہ چوسطے پاسے کر سکیں۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی باشندے دکرغیز، باشقیر، جنھیں مجبور ہو کر بنجر ریگستانوں کا راستہ لینا پڑا، آہستہ آہستہ فنا ہوتے گئے۔

ان لوگوں[30] کے محنت کش عوام کے سلسلے میں پارٹی کا فرض زیادہ ایک اور دو میں جو کچھ بیان ہوا اس کے علاوہ یہ ہے کہ ان کو مقامی روسی آبادی کے محنت کش عوام سے متحد کر دیا جائے تاکہ دونوں مل کر عام طور پر کولاکوں اور خصوصاً لیٹرے روسی کولاکوں سے نجات پانے کے لئے جد وجہد کر سکیں۔ باہر سے آکر آباد ہونے والے کولاکوں کا جوا اتار کر پھینکنے میں ہر طرح ان لوگوں کی مدد کرنی چاہئے اور اس طریقہ سے ان کے لئے ایسی مناسب اراضی مہیا کرنی چاہئے جو انسان کی بسر اوقات کے لئے ضروری ہے۔

۴. ان قوموں اور لوگوں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا، جن کی ایک خاص طبقاتی بناوٹ

[29] روس کے دولت مند کسانوں اور مہاجنوں کو "کولاک" کہا جاتا تھا۔

[30] "لوگوں" کا لفظ انگریزی کے "پیپلس" کی جگہ پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ "قوم" غلط ہوتا کہ وہ ابھی قوم کے درجہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ "عوام" ان کو کہا نہیں جا سکتا کیونکہ مصنف "پیپلس" کے اندر ان کے "محنت کش عوام" کا ذکر کرتا ہے۔ (مترجم)

ہے اور جو ایک خاص علاقے میں آباد ہیں، روسی اشتراکی وفاقی سوویت جمہوریت میں کئی عارضی قومی گروہ، اور قومی اقلیتیں بھی ہیں جو تتر بتر ہو کر دوسری قوموں کی مستحکم اکثریتوں میں جا کر بس گئی ہیں، جن کا اکثر صورتوں میں نہ کوئی طبقاتی ڈھانچہ ہے اور نہ کوئی مخصوص علاقہ (لٹ، استھونی، پولستانی، یہودی وغیرہ)۔ ان کے بارے میں زاریت کی پالیسی یہ تھی کہ ہر ممکن طریقے سے کام لے کر جس میں قتل عام (مثلاً یہودیوں کا منظم قتل عام) بھی شامل تھا ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

لیکن اب ناجائز قومی مراعات کو مٹا دیا گیا ہے، قوموں میں باہمی مساوات قائم ہو گئی ہے اور قومی اقلیتوں کو آزادی سے اپنی قومی نشوونما کا حق مل چکا ہے جس کے لئے سوویت نظام کی نوعیت ہی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اس حالت میں ان قومی گروہوں کے محنت کش عوام کے سلسلے میں پارٹی کا فرض ان کی اس طرح مدد کرنا ہے کہ آزادی سے ترقی کرنے کا ان کو جو حق ملا ہے اس سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

۵. سرحدی علاقوں میں کمیونسٹ تنظیموں کی نشوونما کسی قدر عجیب غریب حالات میں ہو رہی ہے جس سے پارٹی کی سادھارن ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف تو ان علاقوں میں جو روسی کمیونسٹ کام کر رہے ہیں انھوں نے ایک "فرمانروا" قوم کے ماحول میں پرورش پائی ہے، قومی جبر و تشدد کا انھوں نے کبھی مزہ نہیں چکھا۔ اس لئے پارٹی کے کاموں میں اکثر وہ قومی خصوصیتوں کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ کسی مخصوص قوم کی طبقاتی بناوٹ، تہذیب، سماجی زندگی اور تاریخی روایات کی خصوصیتوں کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ اور اس طرح وہ قومی مسئلہ کے متعلق پارٹی کی پالیسی پر بازاری رنگ چڑھا دیتے اور اسے غلط شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کمیونزم سے ہٹ کر

روسی فوقیت، روسی تسلط اور جارحانہ قوم پرستی کے رجحانوں کی سمت میں بھٹکنے لگے ہیں۔ دوسری طرف دیسی کمیونسٹوں کی زندگی قومی جبر و تشدد کے تکلیف دہ زمانے میں گزری ہے۔ اور آج بھی اس زمانے کی مصیبتوں کی یاد ان کے دل سے بالکل محو نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ پارٹی کے کاموں میں قومی خصوصیتوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، محنت کشوں کے طبقاتی مفاد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں یا اس قوم کے محنت کشوں کے مفاد کو اس قوم کے "عام قومی" مفاد سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ایک کو دوسرے سے تمیز نہیں کر سکتے اور اس لئے طبقاتی مفاد پر اپنے کام کی بنیاد بھی نہیں رکھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کمیونزم سے ہٹ کر سرمایہ دارانہ جمہوری قومیت کی سمت میں بھٹکنے لگتے ہیں اور یہ کجروی اکثر مشرق میں، اتحاد اسلامی اور اتحاد ترکیہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

کانگرس ان دونوں کجرویوں کی سختی سے مذمت کرتی ہے کیونکہ وہ کمیونزم کے حق میں مضر اور خطرناک ہیں۔ کانگرس یہ بتانا ضروری سمجھتی ہے کہ پہلی کجروی یعنی قومی فوقیت اور تسلط کے رجحانوں کی سمت میں بھٹکنے کا انجام خاص طور پر مہلک اور مضر ہے۔ کانگرس اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ جب تک قومی تسلط اور قوم پرستی کے خیالات کے بچے کھچے اثرات بھی پارٹی سے بالکل دور نہیں ہو جائیں گے اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ سرحدی علاقوں میں مضبوط اور صحیح معنی میں کمیونسٹ تنظیمیں قائم کی جا سکیں جن کا عوام سے قریبی تعلق ہو، اور جن کے اندر مقامی اور روسی آبادیوں کے مزدور عناصر بین الاقوامیت کی بنیاد پر متحد کئے گئے ہوں۔ اس لئے کانگرس کا خیال ہے کہ سرحدی علاقوں میں پارٹی کا ایک سب سے اہم فرض یہ ہے کہ کمیونسٹوں میں سے قوم پرستی اور خصوصاً قومی تسلط کے رجحانوں کے تمام نراف کی بیخ کنی کر دی جائے۔

میدان جنگ میں ہماری کامیابیوں کی بدولت اور خصوصاً رنگیل[31] کی شکست کے بعد سے سرحد کے بعض پسماندہ علاقوں میں، جہاں عملاً مزدور طبقہ کا کوئی وجود نہیں ہے، درمیانی طبقے کے قوم پرست عناصر اپنے ذاتی اغراض کے پیش نظر پارٹی میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ یہ عناصر اب سمجھنے لگے ہیں پارٹی ہی اصل میں حکمراں طاقت ہے۔ اس لئے وہ کمیونزم کا بھیس اختیار کر لیتے اور اکثر بڑی تعداد میں پارٹی کے اندر گھس آنا چاہتے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی برائیاں اور جارحانہ قوم پرستی کا جذبہ بھی لاتے ہیں جسے وہ کسی طرح چھپانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ سرحدی علاقوں کی پارٹی کمیٹیاں جو عام طور سے کمزور ہیں اکثر اس لالچ کا شکار ہو جاتی ہیں کہ نئے ممبروں کو لے کر پارٹی کو "بڑھایا" جائے۔

کانگرس ہدایت دیتی ہے کہ اس قسم کے نقلی کمیونسٹ عناصر کے خلاف جو رینگنے والے کیڑوں کی طرح پارٹی میں گھس آتے ہیں، سختی کے ساتھ جدوجہد کی جائے۔ یہ کانگرس پارٹی کو خبردار کرتی ہے کہ وہ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ، قوم پرست عناصر کو لے کر پارٹی کو "بڑھانے" کی لالچ میں نہ آئے۔ کانگرس کی رائے ہے کہ سرحدی علاقوں میں پارٹی میں ایسے لوگ داخل کئے جائیں جو خاص طور پر اس علاقے کے مزدور طبقے، اور غریب محنت کش کسانوں سے تعلق رکھتے ہیں، اسی کے ساتھ پوری کوشش کرنی چاہئے کہ پارٹی کے ممبروں کی لیاقت اور صلاحیت کو بڑھا کر پارٹی تنظیموں کو مضبوط کیا جائے۔

---

[31] رنگیل ایک انقلاب دشمن روسی جنرل تھا جس نے اپریل ۱۹۲۰ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مدد سے سوویت حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ کریمیا سے بڑھ کر جنرل رنگیل ڈونیٹز کے علاقے تک پہنچ گیا تھا مگر بالآخر سرخ فوج کے ہاتھوں اسے شکست اٹھانی پڑی۔

قومی مسئلے کے متعلق پارٹی کے فوری فرائض

(رپورٹ ۱۰ مارچ ۱۹۲۱ء کو روسی کمیونسٹ پارٹی کی دسویں کانگریس میں پیش کی گئی تھی)

قومی مسئلے کے متعلق پارٹی کے فوری عملی فرائض پر غور کرنے سے پہلے ہمیں بعض بنیادی باتیں طے کر لینی ہیں جن کے بغیر قومی مسئلے کا کوئی حل ممکن نہیں۔ ان باتوں کا تعلق اس سے ہے کہ قوموں کا ظہور اور قومی جبر و تشدد کی ابتدا کیسے ہوئی۔ تاریخی نشوونما کے دوران میں قومی جبر و تشدد نے کیا شکلیں اختیار کیں اور پھر نشوونما کے مختلف دوروں میں قومی مسئلے کے حل کی کیا صورتیں تھیں۔

اس نشوونما کے تین دور گزرے ہیں۔

سب سے پہلا دور وہ تھا جس نے مغرب میں جاگیریت کو دم توڑتے اور سرمایہ داری کو فتحمند ہوتے ہوئے دیکھا۔ اسی دور میں لوگوں نے قوموں کی شکل اختیار کی۔ میری مراد برطانیہ (آئرستان کو چھوڑ کر)، فرانس اور اطالیہ جیسے ملکوں سے ہے۔ مغرب میں یعنی برطانیہ، فرانس، اطالیہ اور ایک حد تک جرمنی میں جاگیریت کا زوال اور لوگوں کا ترقی کر کے قومیں بن جانا باعتبار وقت اسی دور کی بات ہے جس میں مرکزی ریاستوں کا ظہور ہوا اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں نے آگے بڑھ کر ریاست کا جامہ پہن لیا۔ اور چونکہ ان ریاستوں کے اندر کسی قابل ذکر تعداد میں دوسرے قومی گروہوں کے لوگ نہ تھے اس لئے وہاں قومی جبر و تشدد کا وجود بھی نہ تھا۔ اس کے برخلاف مشرقی یورپ میں جس وقت مرکزی ریاستیں قائم ہوئیں اس وقت قوموں کی تشکیل اور جاگیری انتشار کا خاتمہ نہیں ہوا۔ میرا اشارہ ہنگری، آسٹریا اور روس کی طرف ہے۔ ان ملکوں میں ابھی سرمایہ داری کی نشوونما شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ ابھی شاید وہ اپنی ابتدائی منزلوں میں تھی۔ لیکن ترکوں، منگولوں اور دوسرے مشرقی لوگوں کے حملوں سے بچاؤ کی تدبیر کرنا ضروری تھا۔ اس کا تقاضہ تھا کہ بلا توقف مرکزی ریاستیں قائم کی جائیں جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ حملہ آوروں کی یورش کے مقابلہ میں ثابت قدم رہ سکیں۔ اس طرح مشرقی یورپ میں مرکزی ریاستوں کی تعمیر جتنی تیزی سے ہو رہی تھی اس رفتار سے لوگوں کی قومیں نہیں بن رہی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملی جُلی ریاستیں نمودار ہونے لگیں جن میں کئی قومیت کے لوگ تھے جو ابھی تک اپنے کو قوموں کے قالب میں تو نہیں ڈھال سکے تھے مگر جنہیں ایک مشترکہ ریاست میں متحد کر دیا گیا تھا۔

چنانچہ پہلے دور کی خصوصیت یہ تھی کہ سرمایہ داری نے جب آنکھ کھولی تو قوموں کا بھی ظہور ہوا۔ مغربی یورپ میں ہم دیکھتے ہیں کہ خالص قومی ریاستیں وجود میں آئیں جو قومی جبر و تشدد سے بالکل ناآشنا تھیں۔ لیکن مشرقی یورپ میں ایسی ریاستیں قائم ہوئیں جن میں بہت سی قومیں تھیں۔ ان میں ایک قوم جو زیادہ ترقی یافتہ تھی برسر اقتدار ہو گئی اور دوسری کم ترقی یافتہ قومیں ابتدا میں سیاسی اور بعد میں اقتصادی حیثیت سے حاکم قوم کی غلامی میں آ گئیں۔ یہی کثیر الاقوام ریاستیں اس قومی جبر و تشدد کی جنم بھومی تھیں جہاں قومی جھگڑوں نے سر اٹھایا، قومی تحریکیں پیدا ہوئیں، قومی مسئلہ اور پھر اس مسئلے کے مختلف حل نمودار ہوئے۔

قومی جبر و تشدد اور اس کی مخالفت کے طریقوں کی نشوونما کا دوسرا دور، باعتبار

زمانہ وہی دور تھا جس نے سامراجیت کو ابھرتے دیکھا۔ منڈیوں، پکے مال، کوئلہ، تیل اور سستی استعداد محنت کی تلاش میں سرمایہ داری گھر سے باہر نکلی۔ سرمایہ کی برآمد کرنے اور منڈیوں اور ریل کے بڑے بڑے راستوں پر قبضہ کرنے کی خاطر مقابلہ ہونے لگا۔ سرمایہ داری نے قومی ریاست کی حدود کو توڑ کر باہر قدم رکھا۔ اور وہ دور نزدیک کے ہمسایوں کی زمین چھین کر اپنا علاقہ بڑھانے لگی۔ اس دوسرے دور میں مغربی یورپ کی پرانی قومی ریاستیں یعنی برطانیہ، اطالیہ اور فرانس اب قومی ریاستیں باقی نہیں رہتیں۔ دوسرے لفظوں میں نئے علاقوں پر قبضہ کرلینے کی وجہ سے وہ نوآبادیوں کی مالک، کثیر الاقوام ریاستیں بن گئیں۔ اور اس طرح ان کے یہاں بھی قومی اور نوآبادیاتی جبر و تشدد کا وہ میدان تیار ہوگیا جو مشرقی یورپ میں پہلے سے موجود تھا۔ مشرقی یورپ میں اس دور میں ماتحت قوموں (چیک، پولستانی، یوکرینی) میں بیداری اور نئی زندگی پیدا ہوئی جس نے سامراجی جنگ کی بدولت پرانی، سرمایہ دار کثیر الاقوام ریاستوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور نئی قومی ریاستیں قائم کیں جو بڑی بڑی طاقتوں کی حلقہ بگوش ہوگئی ہیں۔

تیسرا دور سوویتی دور ہے۔ یہ سرمایہ داری کے برباد ہونے اور قومی جبر و تشدد کے ختم ہونے کا دور ہے۔ اس میں حاکم اور محکوم قوموں، نوآبادیوں اور مادری ملکوں کے سوالات تاریخ کے قصہ پارینہ بن گئے ہیں۔ اس دور میں "روسی اشتراکی وفاقی سویت جمہوریت" میں تمام قوموں کو مساوی حقوق اور ترقی کے یکساں موقعے حاصل ہیں۔ لیکن ان میں نابرابری کا کسی قدر اثر پچھلے زمانے سے اب تک چلا آرہا ہے جس کی وجہ ان کی معاشی، سیاسی اور تہذیبی پسماندگی ہے۔ ان قوموں کی نابرابری کی خصوصیت یہ ہے کہ ہماری تاریخی نشوونما کے دوران میں ماضی سے ہمیں جو کچھ ورثہ میں ملا ہے اس میں ایک قوم ابھی خاص دوسری قوم

دوسری قوموں کے مقابلے میں سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلاں قوموں میں ابھی تک نابرابری باقی ہے۔ اور یہ نابرابری سال دو سال میں ختم بھی نہیں کی جا سکتی مگر اس کا مٹایا جانا ازبس ضروری ہے اور یہ مٹائی اس طرح جا سکتی ہے کہ ان پسماندہ قوموں کو معاشی، سیاسی اور تہذیبی امداد بہم پہونچائی جائے۔

تاریخی اعتبار سے ہمیں قومی مسئلے کے ارتقا کے یہی تین دور معلوم ہیں۔

پہلے دونوں دوروں میں ایک مشترک خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان دونوں دور میں قوموں پر جبر و تشدد اور غلامی کی مصیبت جاری رہی اور نتیجہ میں قومی جدوجہد بھی ہوتی رہی لیکن قومی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ مگر دونوں میں ایک فرق بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ پہلے دور میں قومی مسئلہ مختلف کثیر الاقوام ریاستوں کی سرحدوں کے اندر محدود تھا اور اس کا تعلق صرف چند یورپی قوموں کو تھا۔ لیکن دوسرے دور میں مسئلے کی نوعیت بالکل بدل گئی۔ یہ کسی ایک ریاست کا اندرونی مسئلہ باقی نہیں رہا، بلکہ ایک ایسا مسئلہ بن گیا جس سے متعدد ریاستیں بے حد گہرے متاثر ہونے لگیں۔ یہ مسئلہ سامراجی ریاستوں کی باہمی جنگ کا مسئلہ بن گیا جس کا مقصد بے اختیار قوموں پر اپنا تسلط قائم رکھنا، اور یورپ کے باہر نئی قوموں اور قبیلوں کو غلام بنانا تھا۔ اس طرح قومی مسئلہ جس کی اہمیت پہلے صرف نسبتاً مہذب ملکوں کے لئے محدود تھی اب کوئی علیحدہ مسئلہ نہیں رہا، بلکہ نوآبادیوں کے عام مسئلے میں ضم ہوگیا۔

قومی مسئلے کا بڑھ کر نوآبادیوں کے عام مسئلے میں مل جانا کوئی تاریخی حادثہ نہیں۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ سامراجی جنگ کے زمانے میں لڑنے والے سامراجی گروہوں کو نوآبادیوں سے مدد کی اپیل کرنی پڑی کیونکہ وہیں سے ان کو فوج میں بھرتی کے لئے آدمی ملتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کا جس سے مجبور ہو کر سامراجیوں کو غلام

ملکوں کے پچھڑے ہوئے لوگوں سے امداد کی اپیل کرنی پڑی تھی، اس کے سوا دوسرا کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان قبیلوں اور لوگوں میں آزادی اور اس کے لئے جدوجہد کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس کے علاوہ ایک اور سبب ہے جس سے قومی مسئلہ اس قدر بڑھا اور بڑھ کر محکوم ملکوں کا عام مسئلہ بن گیا اور پہلے الگ چنگاریوں کے روپ میں اور پھر تحریک آزادی کا شعلہ بن کر سارے کرۂ ارض پر پھیل گیا۔ اور وہ سبب یہ ہے کہ سامراجی گروہ ترکی کے حصے بخرے کرنا اور اس کی ریاست کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ ترکی جو مسلم اقوام میں سیاسی اعتبار سے سب سے ترقی یافتہ ملک ہے، اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ ترکی نے لڑائی کا جھنڈا بلند کیا اور مشرق کے لوگوں کو سامراج کے خلاف اپنے ساتھ جمع کر لیا۔ تیسرا سبب روس میں سویت جمہوریت کا قائم ہونا تھا جس نے سامراجیت کے خلاف اپنی جدوجہد میں متعدد کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس کی وجہ سے قدرتاً مشرق کے مظلوم انسانوں میں ہمت اور حوصلہ پیدا ہوا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور جدوجہد کے لئے آگے بڑھے۔ اور اس طرح آج آئرستان سے ہندستان تک مظلوم قوموں کا ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی گنجایش پیدا ہو گئی ہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر قومی جبر و تشدد کے دوسرے دور میں سرمایہ دار سماج نے قومی مسئلہ کو حل کرنے اور دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے بدلے قومی جدوجہد کی چنگاریوں کو ایسی ہوا دی ہے جس سے عالمگیر سامراجیت کے خلاف تمام مظلوم قوموں اور محکوم اور نیم محکوم ملکوں میں جدوجہد کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔

اب یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر کوئی نظام حکومت قومی مسئلے کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یعنی ایسے حالات پیدا کر سکتا ہے کہ مختلف قومیں امن و آشتی کے

ساتھ رہ سکیں اور ان میں برادرانہ تعاون ممکن ہو، تو وہ صرف سویت نظام حکومت یعنی مزدور طبقہ کی آمریت ہے۔

یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ سرمایہ کے راج میں جب کہ ذرایع پیداوار کی شخصی ملکیت اور طبقوں کا وجود قائم رہتا ہے قوموں کے درمیان مساوات نہیں قائم ہو سکتی جب تک سرمایہ کی طاقت بنی ہوئی ہے، جب تک ذرایع پیداوار پر قبضہ کرنے کی جدوجہد جاری ہے اس وقت تک قوموں میں نہ تو مساوات ہو سکتی ہے اور نہ قوموں کے محنت کش عوام میں تعاون قائم ہو سکتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قوموں کی نابرابری کو مٹانے، مظلوم اور غیر مظلوم قوموں کے محنت کش عوام میں برادرانہ تعاون قائم کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ سرمایہ داری کو مٹا دیا جائے اور ایک سویت نظام قایم کیا جائے۔

اس کے علاوہ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ جب قومیں انفرادی طور پر اپنے ملکی اور غیر ملکی سرمایہ داروں سے آزادی حاصل کر لیتی ہیں یعنی جب وہ ایک سویت نظام قائم کر لیتی ہیں اس وقت بھی اگر سامراجیت کا عام غلبہ قائم ہو تو وہ قومیں اپنی ہمسایہ سویت جمہوریتوں کی معاشی اور فوجی امداد کے بغیر کامیابی کے ساتھ اپنی انفرادی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتیں۔ ہنگری[23] اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اگر سویت جمہوریتیں ایک سیاسی وحدت میں نہ مل جائیں گی، اگر وہ متحد ہو کر ایک مستحکم فوجی اور معاشی طاقت نہ بن جائیں گی تو وہ عالمگیر سامراجیت کے مقابلہ میں فوجی یا معاشی کسی محاذ پر بھی نہیں ٹھہر سکیں گی۔

---

[23] پچھلی جنگ عظیم کے بعد ہنگری میں بھی مزدور انقلاب کامیاب ہوا تھا اور ایک مزدور حکومت قائم ہوگئی تھی۔ مگر دنیا کے سرمایہ داروں نے مل کر اس کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ پر ایک سرمایہ دار جمہوریت قائم کی۔

سوویت جمہوریتوں کا وفاق ہی اس اتحاد کی خاطر خواہ شکل ہے جس کی زندہ مثال روسی اشتراکی وفاقی سوویت جمہوریت ہے۔

ساتھیو! یہی وہ بنیادی باتیں ہیں جن کا میں پہلے تذکرہ کر دینا چاہتا تھا تاکہ یہ ثابت کر سکوں کہ روسی اشتراکی وفاقی سوویت جمہوریت کے سانچے کے اندر قومی مسئلے کو حل کرنے کے لئے عملی قدم اٹھانا ہماری پارٹی کے لئے بے حد ضروری ہے۔

سوویت نظام حکومت کے تحت روس اور اس کی متحدہ جمہوریتوں میں حاکم اور محکوم قوموں، اندرون وطن اور نوآبادیوں کے لوٹنے والوں اور لوٹے جانے والوں کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود قومی مسئلہ آج بھی روس میں موجود ہے۔ روسی اشتراکی وفاقی سوویت جمہوریت" میں قومی مسئلے کا لُب لباب، اس کا تقاضہ ہے کہ ہم قوموں کی (معاشی، سیاسی اور تہذیبی) پسماندگی کا خاتمہ کریں جو ہمیں ماضی سے ورثہ میں ملی ہے اور پچھڑی ہوئی قوموں کی ترقی کے لئے ایسے موقع پیدا کریں کہ وہ سیاسی، تہذیبی اور معاشی اعتبار سے ترقی کر کے مرکزی روس کی سطح تک آ جائیں۔ پرانے نظام میں زار کی حکومت نے یوکرین، آذربائیجان، ترکستان، اور دوسرے سرحدی علاقوں کی سیاسی زندگی کو ترقی دینے کی مطلق کوشش نہیں کی اور نہ وہ کر ہی سکتی تھی۔ وہ سرحدی علاقوں میں سیاسی زندگی کی نشوونما میں اسی طرح حائل ہوئی جس طرح وہ ان کی تمدنی ترقی کے راستہ میں حائل تھی۔ دیسی آبادیوں کو وہ زبردستی اپنے اندر جذب کر لینے کی کوشش کر رہی تھی اس کے علاوہ پرانی حکومت، زمیندار اور سرمایہ دار ہمارے لئے ورثہ میں کرغیز، چیچن اور اوسیتی جیسی قومیں چھوڑ گئے ہیں جسے مار مار کر انھوں نے ادھ موا کر دیا تھا اور جن کی زمین پر روس کے قزاق اور دولت مند کسان آ کر زبردستی آباد ہو جایا کرتے تھے۔ ان قوموں نے

ناقابل بیان مصیبتیں اٹھائی ہیں، وہ نیست و نابود ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ روسی قوم کو غالب قوم کی حیثیت حاصل تھی۔ اس حیثیت نے روسی قوم کے کیمونسٹوں پر بھی اپنا اثر چھوڑا ہے۔ ان میں یا تو اس بات کی صلاحیت نہیں، اور یا وہ اس کو پسند نہیں کرتے کہ محنت کش دیسی عوام سے قریبی تعلق قائم کریں، ان کی ضرورتوں کو سمجھیں، اور انھیں ان کی پس ماندہ اور غیر متمدن حالت سے نجات حاصل کرنے میں مدد دیں۔ میں ان روسی کیمونسٹوں کی طرف اشارہ کر رہا ہوں (جن کی تعداد زیادہ نہیں) جو اپنے کام میں سرحدی علاقوں کی سماجی زندگی اور تہذیب کی خصوصیتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعض اوقات روسی سرمایہ داروں کی جارحانہ قوم پرستی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح غیر روسی کیمونسٹوں پر غیر روسی قوموں کی حیثیت کا اثر بھی پڑا ہے جو مدتوں قومی مظلومی کی مصیبت اٹھا چکی ہیں۔ ان قوموں کے کیمونسٹ بعض اوقات اپنی قوم کے محنت کش عوام کے طبقاتی مفاد اور نام نہاد "قومی" مفاد میں تمیز نہیں کرتے ہیں۔ میرا اشارہ دیسی کیمونسٹوں کی اس کجروی کی طرف ہے جو انھیں مقامی، دیسی قوم پرستی کی جانب مائل کرتی ہے۔ مشرق میں یہ رجحان اتحاد اسلامی اور اتحاد ترکیہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ہمارا یہ فرض بھی ہے کہ ہم کرغیز، باشقر اور بعض پہاڑی قبیلوں کو فنا ہونے سے بچا لیں اور جو دولتمند کسان وہاں نوآبادیاں بسائے بیٹھے ہیں ان سے وہ زمینیں لے کر اصلی باشندگان ملک کو واپس دے دیں۔

پارٹی کے فوری فرائض کی تصریح ہو چکی۔ اب میں عام فریضہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یعنی یہ فریضہ کہ سرحدی علاقوں میں اور خاص کر مشرق میں ہمیں اپنی پارٹی کی حکمت عملی کو معاشی زندگی کے ان مخصوص حالات کے مطابق بنانا چاہئے جو وہاں پائے جاتے ہیں۔

صورت حال یہ ہے کہ مسعود دو قومیں جن میں زیادہ تر زرعی نسل کے لوگ ہیں اور جن کی تعداد کل ملا کر تین کروڑ کے قریب ہے صنعتی سرمایہ داری کے دور سے نہیں گزری ہیں۔ انھیں اس دور سے گزرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں صنعتی مزدور طبقے کا یا تو سرے سے وجود ہی نہیں یا عملاً نہیں کے برابر ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ انھیں صنعتی سرمایہ داری کے مرحلے کو طے کئے بغیر قدیم طرز کی معیشت سے نکل کر براہ راست سوویت معیشت کے دور میں قدم رکھنا پڑے گا۔ یہ امر مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن ہرگز نہیں۔ ایسا کرنے کی غرض سے ہمیں ان کی معاشی زندگی کی تمام خصوصیتوں کو بلکہ ان کی تاریخ، ان کی سماجی زندگی، اور ان کی تہذیب کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا۔ اصلی روس میں جو تدبیریں کارگر اور ضروری ثابت ہوئی ہیں ان کو ہو بہو ان قوموں کے علاقوں میں اختیار کر لینا مہمل اور خطرناک ہے ظاہر ہے کہ روسی اشتراکی وفاقی سوویت جمہوریت کی معاشی پالیسی کو عمل جامہ پہناتے وقت ہمیں ان سرحدی علاقوں کی معاشی زندگی، طبقاتی بناوٹ، اور تاریخی روایات کی تمام خصوصیتوں کو دھیان میں رکھنا ہوگا۔ ایک لمحے کے لئے بھی ہم اس سے غفلت نہیں برت سکتے۔ یہاں ان بیہودہ حرکتوں کے ذکر میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، جن کی ایک مثال یہ ہے۔ کرغیزیہ کے لئے غذا کا جو حصہ مقرر کیا گیا تھا اس میں محکمہ غذا کا مطالبہ تھا کہ کچھ سور بھی بھیج دئے جائیں۔ حالانکہ وہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے باشندے مسلمان ہیں اور مسلمان سور نہیں پالتے۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ رسم و رواج کی خصوصیتوں کو دھیان میں رکھنے کی بالکل پروا نہیں کرتے، حالانکہ یہ ایسی خصوصیتیں ہیں جو کسی عام سیاح کی نظر سے بھی چھپی نہیں رہتیں۔

مجھے ابھی ایک پرچہ ملا ہے جس میں خواہش کی گئی ہے کہ میں کامریڈ چیچرین کے مضامین کا جواب دوں۔ ساتھیو! میں نے کامریڈ چیچرین کے مضامین بغور پڑھے ہیں اور میرے خیال میں ان میں صرف انشا پردازی کی گئی ہے۔ ان میں چار غلطیاں یا غلط فہمیاں ہیں۔

اولاً کامریڈ چیچرین کا میلان یہ ہے کہ سامراجی ریاستوں کے باہمی تضاد سے انکار کر دیں، سامراجیوں کے بین الاقوامی اتفاق کو بڑھا چڑھا کر بیان کریں اور سامراجی گروہوں اور ریاستوں (فرانس، امریکہ، برطانیہ، جاپان وغیرہ) کے اندرونی تضادوں کو بالکل نظر انداز کر دیں یا ان کی اہمیت کم کر کے دکھائیں، حالانکہ یہ تضاد موجود ہیں اور انھیں کی بدولت جنگ ہوتی ہے۔ انھوں نے سامراجی حکمرانوں کے اتفاق رائے کے بارے میں مبالغے سے کام لیا ہے اور ان کی دوستی کے اندر جو تضاد کام کر رہا ہے اس کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ لیکن یہ تضاد موجود ہیں اور ہماری وزارت خارجہ کی سرگرمیوں کی بنیاد انھیں پر ہے۔ کامریڈ چیچرین نے ایک دوسری غلطی بھی کی ہے۔ بڑی بڑی حکومتوں اور نئی بنی ہوئی قومی ریاستوں (زیکوسلواکیا، پولستان اور فن لینڈ) کے درمیان جو تضاد کام کر رہا ہے وہ اس کی اہمیت کو بھی بہت کم کر دیتے ہیں۔ نئی بنی ہوئی قومی ریاستیں مالیاتی اور فوجی اعتبار سے بڑی بڑی حکومتوں کی ماتحت ہیں۔ کامریڈ چیچرین اس حقیقت سے بالکل آنکھ بچا گئے کہ بڑی بڑی حکومتوں کی اس ماتحتی کے باوجود بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسی ماتحتی کی وجہ سے ان بڑی حکومتوں اور ان نئی بنی ہوئی ریاستوں میں تضاد پیدا ہو گئے ہیں جن کا اظہار مثال کے طور پر پولستان اور استھونیہ وغیرہ سے گفت و شنید کے دوران میں ہو چکا ہے۔ عوامی وزارت امور خارجہ کے وجود کی ساری غرض ہی یہ ہے کہ وہ ان تضادوں کا جائزہ لیتی رہے، انھیں پر اپنی حکمت عملی کی بنیاد رکھے اور انھیں تضادوں کے دائرے کے اندر اپنے گٹھ جوڑوں میں ہیر پھیر کرتی رہے۔ کامریڈ چیچرین نے اس عنصر کو اس قدر معمولی قرار دیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کامریڈ چیچرین

تنقید: چیچرین اس زمانے میں سوویت حکومت میں وزیر خارجہ تھا۔ اس نے کمیونسٹ پارٹی کے اخبار پراودا میں کئی مضامین لکھے تھے جن کا عنوان تھا "اسٹالن کے مقالے کا جواب"۔ یہاں انہی مضامین کی طرف اشارہ ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے بار بار قومی خود ارادیت کا ذکر کیا ہے حالانکہ اب یہ نعرہ اتنا کھوکھلا اور بے معنی ہو چکا ہے جس سے سامراجی حکمران بھی آسانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تعجب ہے کہ کامریڈ چیچرین کو یہ یاد نہ رہا کہ ہم لوگ اس نعرہ کو دو برس پہلے چھوڑ چکے ہیں۔ ہمارے پروگرام میں یہ نعرہ شامل نہیں۔ ہمارے پروگرام میں اب قومی خود ارادیت کے مبہم نعرہ کا ذکر نہیں بلکہ اب تو ہم نہایت ہی واضح اور متعین الفاظ میں ایک دوسرا نعرہ یعنی قوموں کی سیاسی علیحدگی کا حق پیش کر رہے ہیں۔ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ تعجب ہے کہ اپنے مضمونوں میں کامریڈ چیچرین نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا اور اس لئے جب وہ ایک ایسے نعرے پر اعتراض کرتے ہیں جو مبہم اور بے معنی ہو گیا ہے تو گویا ایک غلط چیز پر نشانہ باندھ رہے ہیں۔ کیونکہ "خود ارادیت" کے متعلق میرے مقالے یا پارٹی کے دستور العمل میں کہیں بھی ایک لفظ نہیں۔ ان میں جس چیز کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ قوموں کی سیاسی علیحدگی کا حق ہے اور اس وقت جبکہ محکوم ملکوں میں آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی ہے یہ نعرہ ایک انقلابی نعرہ ہے۔ سوویت ریاستیں چونکہ اپنی رضامندی سے وفاق میں شامل ہوتی ہیں اس لئے یہاں اس حق سے کام نہیں لیا جاتا۔ روسی اشتراکی وفاقی سوویت جمہوریتوں میں جو قومیں شامل ہیں ان کی مرضی یہی ہے۔ اور جب ہم آبادیوں کا ذکر کرتے ہیں جو برطانیہ، فرانس، امریکہ اور جاپان کے قبضے میں ہیں، جب ہم عراق، عرب، ترکی، ہندستان جیسے محکوم ملکوں کا ذکر کرتے ہیں جو اتحادیوں کی غلامی میں ہیں تو اس وقت قوموں کے حق علیحدگی کا نعرہ ایک انقلابی نعرہ ہے اور اس نعرہ کو ترک کرنا اتحادیوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جانا ہے۔ غلط فہمی کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ کامریڈ چیچرین کے مضمون میں ایک بھی عملی تجویز نہیں پیش کی گئی ہے۔ مضمون لکھنا تو بہت آسان ہے۔ لیکن جب آپ مضمون کا عنوان لکھتے ہیں "کامریڈ اسٹالین کے مقالے کا جواب" تو آپ کو کچھ ایسی باتیں کہنی چاہئیں جو توجہ کے قابل ہوں۔ کم ازکم جواب میں کچھ عملی تجویزیں پیش کرنی چاہئیں۔ لیکن مجھے ان کے مضامین میں ایک عملی تجویز ایسی نہیں ملی جو توجہ کے لائق ہو۔

ساتھیو! اب میں رپورٹ ختم کرتا ہوں۔ ہم حسب ذیل نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ سرمایہ دار سماج مسئلے کو حل کرنے کے نا اہل ثابت ہو چکا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس کو "حل" کرنے کی کوشش میں اس نے اسے اور بڑھا دیا۔ قومی مسئلے کو نو آبادیات کا مسئلہ بنا دیا اور اپنے خلاف ایک نیا محاذ قائم کر لیا جو آئرستان سے ہندستان تک پھیلا ہوا ہے۔ صرف وہی ریاست قومی مسئلے کو حل کر سکتی ہے جس کی بنیاد ذرائع اور آلات پیداوار کی اجتماعی ملکیت پر ہو یعنی جو سوویت ریاست ہو۔ سوویتی وفاقی ریاست میں نہ مظلوم قومیں ہیں اور نہ حکمران قومیں۔ قومی جبر و تشدد مٹا دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ سرمایہ دارانہ نظام ہمارے لئے ورثہ میں ایک ایسی حالت چھوڑ گیا ہے جس میں زیادہ متمدن اور کم متمدن قوموں میں عملی طور پر (تہذیبی، معاشی اور سیاسی) نابرابری موجود ہے۔ ایسی صورت میں قومی مسئلے کا تقاضہ ہے کہ ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں جن سے پچھڑی ہوئی قوموں کے محنت کش عوام معاشی، سیاسی اور تہذیبی ترقی کر سکیں اور انہیں اس بات کا موقع ملے کہ وہ وسطی روس کے زیادہ ترقی یافتہ مزدور طبقے کی سطح تک پہنچ سکیں۔ قومی مسئلہ پر اپنے مقالے کے تیسرے حصے میں میں نے جو عملی تجویزیں پیش کی ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہیں۔

بحث کا جواب

ساتھیو! قومی مسئلے پر بحث مباحثے کے سلسلے میں اس کانگرس کی سب سے ممتاز خصوصیت یہی ہے کہ قومی مسئلے پر اعلانات جاری کرنے کے بعد، نظم و نسق کے اعتبار سے روس کی نئی تقسیم کر کے اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں مسئلے کو عملی صورت میں پیش کیا جا سکے۔ اکتوبر کے انقلاب کے شروع میں ہم نے قوموں کے حق علیحدگی کا اعلان کر دینے پر اکتفا کر دیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۸ء اور سنہ ۱۹۲۲ء میں ہم نے روس کو قومیت کے مطابق نظم و نسق کے نئے طور پر تقسیم کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پچھڑی ہوئی قوموں کے محنت کش عوام اور روس کے مزدور طبقے میں زیادہ قریبی تعلق قائم کیا جائے۔ اور آج اس کانگرس میں ہم اس مسئلے کو خالص عملی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ آج ہم اس سوال پر غور کر رہے ہیں کہ روس کے ساتھ جو خود مختار علاقے اور آزاد جمہوریتیں متحد ہیں وہاں کے محنت کش عوام اور متوسط طبقے کے لوگوں کے حق میں پارٹی کو کون سی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اسی لئے مجھے کامریڈ زاتسکی کا یہ بیان سن کر حیرت ہوئی کہ آپ کے سامنے جو مقالہ پیش کیا گیا ہے اس کی حیثیت محض خیالی ہے۔ میرے ہاتھ میں اس وقت خود ان کا مقالہ بھی موجود ہے جسے انھوں نے کسی وجہ سے کانگرس کے سامنے پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس مقالے میں مجھے ایک بھی تجویز ایسی نہیں ملی جسے عملی کہا جا سکے، ماسوا اس کے کہ انھوں نے "روسی اشتراکی سوویت جمہوریتوں کا وفاق" کا نام بدل کر "مشرقی یورپ" نام رکھنے کی تجویز کی ہے...... اس کے علاوہ اس مقالے میں مجھے کوئی عملی تجویز نہیں ملی۔

اب میں دوسرے سوال کو لیتا ہوں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جن نمایندوں نے یہاں تقریریں کی ہیں ان سے مجھے بہت زیادہ امید تھی۔ روس میں بائیس[۲۲] سرحدی علاقے ہیں۔ ان میں سے بعض علاقوں میں صنعت بہت زیادہ ترقی کر چکی ہے۔ صنعتی اعتبار سے یہ علاقے روس سے زیادہ مختلف نہیں۔ بعض ایسے علاقے بھی ہیں جو سرمایہ داری کے دور سے نہیں گزرے اور وسطی روس سے وہ بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ پھر کچھ ایسے علاقے بھی ہیں جو بالکل پچھڑے ہوئے ہیں۔ الگ الگ قسم کے ان تمام سرحدی علاقوں پر اس مقالے میں ٹھوس اور جامع طریقے سے بحث کرنا ممکن نہیں تھا۔ کوئی شخص یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ اس مقالے میں جس کا تعلق بحیثیت مجموعی پوری پارٹی سے ہے صرف ترکستان یا صرف آذربائیجان یا یوکرین سے بحث کی جائے۔ یہ ضروری تھا کہ اہم باتوں کو چن کر کے مقالے میں پیش کیا جائے جو تمام سرحدی علاقوں میں مشترک اور ان کی امتیازی صفت ہیں۔ تفصیل سے پرہیز کرنا بھی ضروری تھا۔ انسان نے تجویزیں مرتب کرنے کا اب تک کوئی اور طریقہ ایجاد نہیں کیا۔ غیر روسی قوموں کی تعداد تقریباً ساڑھے چھ کروڑ ہے۔ غیر روسی قوموں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ریاست کی حیثیت سے ان کی نشوونما ابھی وسطی روس کے درجے تک نہیں ہوئی ہے۔ ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ان قوموں یعنی انکے مزدوروں اور محنت کش عناصر کی ہر طرح امداد کریں تاکہ وہ اپنی زبان میں اپنی سوویت ریاستی زندگی کی نشوونما کر سکیں۔ مقالے کے جس

حصے میں عملی تجویزوں سے بحث کی گئی ہے وہاں اس مشترک خصوصیت کا بھی ذکر آیا ہے۔ پھر اگر ہم سرحدی علاقوں کی امتیازی صفات کی تشریح زیادہ ٹھوس طریقے سے کرنا چاہیں تو ہمیں غیر روسی قوموں کی ساڑھے چھ کروڑ کی آبادی میں سے ترکی نسل کی کم و بیش تین کروڑ آبادی کو الگ کر لینا پڑے گا جو ابھی تک سرمایہ داری کے دور سے نہیں گزرے ہیں۔ کامریڈ میکویان کا یہ کہنا غلط ہے کہ آذربائیجان کئی اعتبار سے روس خاص کے صوبوں سے آگے ہے۔ وہ شاید باکو[۳۴] کو ہی پورا آذربائیجان سمجھتے ہیں۔ لیکن باکو آذربائیجان کی گہرائیوں سے نہیں نکلا۔ اسے نوبل، راتھس چائلڈ اور ڈشو[۳۵] وغیرہ نے لا کر اوپر سے لگا دیا ہے۔ لیکن آذربائیجان خود ایک نہایت ہی پسماندہ ملک ہے جہاں آج بھی سرقبیلی، جاگیری تعلقات قائم ہیں۔ اسی لئے میں نے پورے آذربائیجان کو سرحدی علاقوں میں شمار کیا ہے جو سرمایہ داری کے دور سے نہیں گزرے ہیں۔ ان علاقوں کو سوویت نظام معیشت کی راہ پر لگانے کے لئے خاص طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔ مقالے میں اس کی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس میں اسی لاکھ یا ایک کروڑ سے زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ یہ زیادہ تر گلہ بانوں کے قبیلے ہیں جن میں قبائلی طرز زندگی بہت مضبوطی سے قائم ہے۔ انہوں نے ابھی تک زراعت بھی اختیار نہیں کی ہے۔ ان میں خاص طور پر کرغیز، شمالی ترکستان کے باشندے، باشقر، چیچن، اوسیتی اور انگوش شامل ہیں۔ ان قوموں کے سلسلے میں ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ہم ان کے لئے کافی زمین مہیا کریں۔ کرغیز نمائندے کو یہاں تقریر کرنے کا

۳۴۔ باکو، آذربائیجان کا ایک مشہور شہر اور تیل کی صنعت کا ایک بڑا مرکز ہے۔

۳۵۔ یہ غیر ملکی سرمایہ دار ہیں جو زار روس کے زمانے میں باکو کے تیل کے چشموں اور روس کے متعدد کارخانوں کے مالک تھے۔

موقع نہیں ملا کیونکہ بحث ختم ہو گئی تھی۔ ورنہ وہ اس موقعہ پر پہاڑی، باشقیریہ، کرغیز اور عزتری قبیلوں کی مصیبتوں کا حال سناتے جو آج زمین نہ ہونے کی وجہ سے نیست و نابود ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں صفاروف نے یہاں جو کچھ کہا ہے اس کا تعلق صرف اسی لاکھ یا ایک کروڑ کی آبادی سے ہے۔ اس لئے کامریڈ صفاروف کی عملی تجویزوں کو بڑھا کر تمام سرحدی علاقوں پر چسپاں کرنا کسی طرح مناسب نہ ہو گا۔ دوسری غیر روسی قوموں کے لئے ان تجویزوں کی مطلق کوئی اہمیت نہیں۔ اور ان کی تعداد تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ ہے۔ کامریڈ صفاروف نے بعض قوموں کے بارے میں تجویز کی مختلف دفعات میں جو ٹھوس ترمیمیں وغیرہ کی ہیں اور جہاں کہیں ان میں اضافہ یا اصلاح کی ہے اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے کہنا صرف یہ ہے کہ ان ترمیموں کو ہمہ گیر نہیں بنا دینا چاہئے۔ لیکن اس موقع پر مجھے کامریڈ صفاروف کی ایک ترمیم کے بارے میں ضرور کچھ کہنا ہے۔ ان کی ایک ترمیم میں "قومی تہذیبی خود ارادیت" کی اصطلاح آئی ہے۔ وہ ترمیم یوں ہے۔

"اکتوبر کے انقلاب سے پہلے سامراجی پالیسی نے روس کے مشرقی سرحدی علاقوں کے لئے اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ اپنی قومی تہذیبی خود ارادیت، اپنی قومی زبان میں تعلیم وغیرہ کے ذریعہ سے سرمایہ دار تمدن کی تہذیبی برکتوں سے فیض اٹھا سکیں۔"

مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ میں اس ترمیم کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ اس سے "بند" کے نقطہ نظر کی بو آتی ہے۔ قومی تہذیبی خود ارادیت بند والوں کا نعرہ ہے۔ ہم بہت پہلے خود ارادیت کے مبہم نعرے کو ترک کر چکے۔ اس میں دوبارہ جان ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ اس اصطلاح میں الفاظ کو نہایت ہی غیر فطری طریقے سے جمع کر دیا گیا ہے۔

مجھے ایک پرزہ ملا ہے جس میں الزام عائد کیا گیا ہے کہ ہم کمیونسٹ مصنوعی طریقے سے سفید روسی قوم کی تعمیر کر رہے ہیں۔ یہ درست نہیں، کیونکہ سفید روسی قوم پہلے سے موجود ہے۔ اس کی اپنی ایک زبان ہے جو روسی زبان سے مختلف ہے۔ اور اس لئے سفید روسی قوم کا تہذیبی معیار اس کی مادری زبان کے ذریعے ہی بلند کیا جا سکتا ہے۔ پانچ سال پہلے اسی طرح کی باتیں یوکرین اور یوکرینی قوم کے بارے میں بھی کہی جاتی تھیں۔ اور ابھی یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ یوکرینی جمہوریت اور یوکرینی قومیت جرمنوں کی ایجاد ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یوکرینی قوم کا وجود ہے، اور اس کی تہذیب کو فروغ دینا کمیونسٹوں کا فرض ہے۔ ہمیں تاریخ کے دھارے کے خلاف نہیں چلنا چاہئے۔ اگرچہ آج یوکرین کے شہروں میں روسی عناصر غالب ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ امتداد زمانہ سے ان شہروں پر یوکرینی اثر چھا جائے گا۔ تقریباً چالیس سال پہلے ریگا ایک جرمن شہر تھا۔ لیکن شہر تو دیہات والوں کے آکر بستے رہنے سے بڑھتے ہیں۔ اور دیہات قومیت کے پاسبان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ریگا خالص لٹ قوم کا شہر ہے۔ تقریباً پچاس برس پہلے ہنگری کے تمام شہروں پر جرمنوں کی چھاپ تھی لیکن آج ان پر مگیار تہذیب کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ یہی بات سفید روس پر صادق آئے گی۔ اگرچہ آج اس کے شہروں پر غیر سفید روسیوں کا غلبہ ہے۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے میں تجویز کرتا ہوں کہ کانگرس ایک کمیٹی منتخب کرے جس کے ارکان انہیں علاقوں کے نمائندے ہوں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مقالہ میں جن عملی تجویزوں کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق تمام سرحدی علاقوں سے ہے ان کو زیادہ ٹھوس صورت میں مرتب کیا جا سکے۔

سوویت جمہوریتوں کا اتحاد

یہ رپورٹ جمہوریہ سوویت کی سوویتوں کی پہلی کانگرس میں ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء کو پیش کی گئی تھی

ساتھیو! آج کا دن سوویت حکومت کی تاریخ میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا دن ہے جو دو دوروں کے درمیان ایک نشان راہ قائم کرتا ہے۔ آج پرانا دور ختم ہوتا ہے جب کہ سوویت جمہوریتیں کام تو مل کر کرتی تھیں مگر ہر ایک کی اپنی راہ الگ تھی۔ اور ہر ایک کو سب سے پہلے اپنی بقا اور اپنے تحفظ کی فکر تھی۔ اب ایک نیا دور شروع ہو چکا ہے جب کہ ہر سوویت جمہوریت کی علیحدہ زندگی کا خاتمہ ہو رہا ہے اور یہ جمہوریتیں ایک ہی وفاقی ریاست میں متحد کی جا رہی ہیں تاکہ وہ کامیابی کے ساتھ اقتصادی ابتری کا مقابلہ کر سکیں۔ آج سے سوویت حکومت کا کام صرف اپنی بقا اور تحفظ کی فکر کرنا نہیں بلکہ ایک اہم بین الاقوامی طاقت بن جانا ہے، اتنی قدرت پیدا کرنی ہے کہ وہ بین الاقوامی حالات پر اپنا اثر ڈال سکے اور انھیں محنت کشوں کے حق میں مفید طور سے تبدیل کر سکے۔

پانچ سال پہلے سوویت حکومت کیا تھی؟ ایک چھوٹی سی ناقابل توجہ چیز، جسے دیکھ کر اس کے دشمن حقارت سے مذاق اڑایا کرتے اور دوست اس پر ترس کھاتے تھے۔ وہ ابتری

اور انتشار کا زمانہ تھا جب کہ سویت حکومت کا وجود اپنی طاقت پر اس قدر منحصر نہیں تھا جتنا اپنی دشمنوں کی کمزوری پر۔ اس وقت سویت کے دشمنوں میں پھوٹ تھی، وہ دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک آسٹریا جرمنی وغیرہ کا گروہ تھا اور دوسرا انگریزوں اور فرانسیسوں وغیرہ کا۔ دونوں باہمی جنگ و جدال میں مبتلا تھے اور اس حالت میں نہ تھے کہ اپنے ہتھیاروں کا رخ سویت حکومت کے خلاف پھیر سکیں۔ سویت حکومت کی تاریخ میں یہ جنگی ابتری کا زمانہ تھا۔ لیکن کولچک اور دینیکن[۳۶] کے حملوں کی چھاؤں میں سویت حکومت نے سرخ فوج بنائی اور اس ڈوبتی حالت سے کامیاب نکل آئی۔

اس کے بعد سویت حکومت کی تاریخ کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں ہم نے اقتصادی ابتری کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ یہ دور ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ لیکن اس کے نتیجے ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اس دور میں سویت حکومت نے کامیابی کے ساتھ قحط پر قابو پالیا جو پچھلے سال شروع ہوا تھا۔ اس دور میں زراعت نے کافی ترقی کی اور ہلکی صنعت پھر سے شروع ہو گئی ہے۔ ایسے کارکن پیدا ہو گئے ہیں جو صنعتی رہنما بن سکیں اور انھیں سے ہماری امیدیں اور ہمارا اعتماد وابستہ ہے لیکن اقتصادی ابتری کا بالکل خاتمہ کرنے کے لئے یہ کافی نہیں۔ ابتری کا مقابلہ کرنے اور اس کو بالکل مٹا دینے کے لئے تمام سویت جمہوریتوں کی

۳۶ یہ دونوں انقلاب دشمن جنرل تھے جنھوں نے اکتوبر کے انقلاب کے بعد سویت حکومت کا تختہ الٹنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اتحادی خاص کر برطانیہ، فرانس، امریکہ اور جاپان بھی ان کی ہر طرح مدد کر رہے تھے۔ کولچک نے شمال میں سائبریا میں اور دینیکن نے جنوب میں بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اور دونوں قریب قریب ایک ہی وقت میں ماسکو کی طرف بڑھنے لگے۔ مگر سرخ فوج اور سرخ چھاپاماروں کے ہاتھوں ان کو سخت شکست اٹھانی پڑی۔

قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہوگا۔ تمام جمہوریتوں کے مالیاتی اور معاشی وسائل کو اس ایک مقصد کے لئے وقف کر دینا ہوگا کہ ہماری صنعت کی بنیادی شاخیں از سر نو قائم ہو جائیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ سویت جمہوریتوں کو ایک ہی وفاقی ریاست میں متحد کر دیا جائے۔ چنانچہ آج ہماری جمہوریتیں، ہماری معیشت کو از سر نو استوار کرنے کے لئے، اپنی تمام قوتوں کو ایک ساتھ لانے کی غرض سے ایک ہی ریاست میں متحد ہو رہی ہیں۔

جنگ سے پیدا کئے ہوئے انتشار کے خلاف ہماری فوجی جدوجہد کے دنوں میں سرخ فوج وجود میں آئی جو سویت حکومت کی زندگی کا ایک سنگ بنیاد ہے۔ دوسرا دور اقتصادی ابتری کے خلاف جدوجہد کرنے کا دور ہے۔ اس دور میں ہماری ریاستی زندگی کا ایک نیا سانچہ یعنی سویت جمہوریتوں کا اتحاد وجود میں آ رہا ہے جس سے بلاشبہ سویت معیشت کو استوار کرنے میں مدد ملے گی۔

آج سویت حکومت کی حالت کیا ہے؟ یہ محنت کشوں کی ایک عظیم الشان طاقت ہے جسے دیکھ کر اب اس کے دشمن حقارت سے مذاق نہیں اڑاتے بلکہ اپنے دانت پیس رہے ہیں۔

پچھلے پانچ برسوں میں سویت حکومت کی ترقی کی یہ مختصر روداد ہے۔

لیکن ساتھیو! آج صرف پچھلی باتوں پر غور کرنے کا دن نہیں، آج پرانے روس پر نئے روس کی فتح کا دن ہے، اس پرانے روس پر جو یورپ میں پولیس کے سپاہی اور ایشیا میں جلاد کا کام کیا کرتا تھا۔ آج کا دن نئے روس کی فتح کا دن ہے، اس نئے روس کی جس نے قومی جبر و تشدد کی زنجیریں توڑ دی ہیں، جس نے سرمایہ داری کا سر کچل دیا اور مزدور طبقے کی آمریت قائم کی ہے، جس نے مشرق کی قوموں کو بیدار کیا، اور

مغرب کے مزدوروں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ سرخ جھنڈا اب تک ایک پارٹی کا جھنڈا تھا۔ اسے اس نے آج ایک ریاست کا جھنڈا بنا دیا ہے جس کے سائے میں سویت جمہوریتوں کی قومیں جمع ہیں تاکہ ایک ہی ریاست میں سویت اشتراکی جمہوریتوں کے اتحاد میں متحد ہو جائیں جو ایک عالمگیر سویت اشتراکی جمہوریت کا پیش خیمہ ہے۔

ہم کمیونسٹوں کو اکثر یہ کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے کہ ہم میں تعمیر کی صلاحیت نہیں ہے۔ لیکن سویت حکومت کی ان پچھلے پانچ برسوں کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ کمیونسٹوں میں تعمیر کی قابلیت بھی موجود ہے۔ آج کی سویتوں کی کانگرس کا مقصد جمہوریتوں کے اتحاد کے اعلان اور عہدنامہ کی تصدیق کرنا ہے۔ جسے جمہوریتوں کے بااختیار نمائندوں کی کانفرنس نے کل منظور کیا تھا۔ آج تمام جمہوریہ متحدہ کی یہ کانگرس ان تمام لوگوں کو جن میں سوچنے سمجھنے کا کسی قدر مادہ بھی موجود ہے، یہ بتا دے گی کہ کمیونسٹ اگر پرانی چیزوں کو برباد کر سکتے ہیں تو نئی چیزوں کی تعمیر کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔

ساتھیو! اب میں آپ کو وہ اعلان پڑھ کر سناتا ہوں جسے کل نمائندوں کی کانفرنس نے منظور کیا ہے۔

سویت اشتراکی جمہوریتوں کے اتحاد کا اعلان

سویت جمہوریتوں کے قائم ہونے کے بعد سے دنیا کی ریاستیں دو موچوں میں بٹ گئی ہیں۔ ایک سرمایہ داری کا مورچہ اور دوسرا اشتراکیت کا مورچہ ہے۔

ادھر سرمایہ داری کے مورچے میں قومی دشمنی اور نابرابری، نوآبادیوں کی غلامی اور جنگجو وطن پرستی، قوموں پر جبر و تشدد اور ان کا قتل عام، سامراجی درندگی اور جنگوں کا دور دورہ ہے۔ یہاں اشتراکیت کے مورچے میں باہمی اعتماد اور امن، قومی آزادی اور برابری کا دور دورہ ہے۔ قومیں صلح و آشتی سے رہتی اور ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ تعاون کرتی ہیں۔

دنیائے سرمایہ داری بیسیوں برس سے اس کوشش میں ہے کہ قوموں کے مسئلے کو حل کرے۔ اس غرض سے اس نے اپنے نظام سے جہاں آدمی آدمی کا استحصال کرتا ہے، قوموں کی آزادانہ ترقی کا رشتہ جوڑنا چاہا۔ لیکن اس کی کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ اس کے برعکس قومی تضادوں کی گتھی دن بدن الجھتی ہی گئی اور آج سرمایہ داری کے وجود کے لئے ایک خطرہ بن گئی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ قوموں میں تعاون پیدا کرنے میں قطعی ناکام ثابت ہوا ہے۔

قومی جبر و تشدد کو مٹانے، قوموں میں باہمی اعتماد کا ماحول پیدا کرنے اور برادرانہ

تعاون کی بنا ڈالنے کے موقع آج صرف سوویت کیمپ ہی میں، مزدور طبقے کی آمریت کے تحت پیدا ہوئے ہیں جس نے آبادی کی بہت بڑی اکثریت کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کر لیا ہے۔

یہ انہی حالات کا نتیجہ تھا کہ سوویت جمہوریتیں ساری دنیا کے (ملکی اور غیر ملکی) ہر طرح کے سامراجیوں کے حملوں کو کامیابی سے پسپا کر سکیں۔ اور یہ بھی انھیں حالات کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے کامیابی کے ساتھ خانہ جنگی کو ختم کیا، اپنی ہستی کو قائم رکھا اور پُر امن اقتصادی تعمیر شروع کی۔

لیکن جنگ کا زمانہ اپنی نشانیاں چھوڑ گیا ہے۔ کھیتیاں تباہ ہیں، کارخانے بند پڑے ہیں، پیداوار کی قوتیں ٹوٹی بکھری پڑی ہیں اور اقتصادی وسائل برباد ہو گئے ہیں۔ یہ جنگ کا ترکہ ہے کہ الگ الگ جمہوریتیں اپنی انفرادی کوششوں سے اپنی معیشت کی تعمیر نہیں کر سکتیں۔ قومی معیشت کی از سرِ نو تعمیر کرنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک سوویت جمہوریتیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنی تنہا زندگی بسر کرنے میں مصروف ہیں۔

دوسری طرف بین الاقوامی صورتِ حال کا کوئی بھروسہ نہیں۔ نئے حملوں کا خطرہ ہے۔ ایسی صورت میں یہ لازم ہے کہ سرمایہ داری کے محاصرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے سوویت جمہوریتیں ایک متحدہ محاذ قائم کریں۔

اور آخری بات یہ ہے کہ سوویت حکومت اپنی طبقاتی نوعیت کے اعتبار سے ایک بین الاقوامی قوت ہے اس کی ساخت ہی ایسی ہے جو سوویت جمہوریتوں کے محنت کش عوام کو مجبور کرتی ہے کہ ایک ہی اشتراکی خاندان میں متحد ہو جائیں۔

ان تمام حالات کا شدید تقاضا ہے کہ سوویت جمہوریتیں ایک ہی وفاقی ریاست میں متحد ہو جائیں جو اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھنے کی اہلیت رکھتی ہو اور جو اندرونی معاشی ترقی اور لوگوں کی آزادانہ قومی نشو و نما کی ضمانت ہو سکے۔

سوویت جمہوریتوں کی قوموں کے نمائندوں نے جو ابھی حال میں اپنی سوویتوں کی کانگرسوں میں جمع ہوئے تھے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا ہے کہ سوویت اشتراکی جمہوریتوں کا اتحاد قائم کیا جائے۔ یہ اس امر کی یقینی ضمانت ہے کہ اس اتحاد میں مساوی درجہ رکھنے والی قومیں اپنی رضامندی سے شریک ہو رہی ہیں، اور ہر جمہوریت کو آزادی کے ساتھ اس اتحاد سے الگ ہو جانے کا حق حاصل ہے، اور تمام اشتراکی سوویت جمہوریتوں کے لئے جو آج موجود ہیں یا آگے چل کر قائم ہوں، اس اتحاد میں داخل ہونے کا دروازہ کھلا ہوا ہے، یہی اس بات کی ضمانت بھی ہے کہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں قوموں کی پُر امن زندگی اور برادرانہ تعاون کی جو بنیاد ڈالی گئی تھی، یہ نئی وفاقی ریاست اس کے شایانِ شان ثابت ہو گی۔ یہ ریاست دنیا کی سرمایہ داری کے مقابلہ میں ایک مضبوط دیوار اور تمام ملکوں کے مزدوروں کو ایک عالمگیر اشتراکی سوویت جمہوریت میں متحد کرنے کے لئے ایک نیا اور فیصلہ کن قدم ہے

دنیا کے سامنے ان تمام باتوں کا اعلان کرتے ہوئے ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ سوویت حکومت کی بنیادیں جن کا اظہار اشتراکی سوویت جمہوریتوں کے دستوروں میں ہوتا ہے بہت مستحکم ہیں ہم اپنی جمہوریتوں کے مقرر کئے ہوئے نمائندے ہیں اور انہی کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپس میں ایک معاہدہ کر کے سوویت اشتراکی جمہوریتوں کا اتحاد قائم کریں۔

مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کے سیاسی فرائض

(۱۸ مئی ۱۹۲۵ء کو یونیورسٹی کے طلبا کے ایک جلسے میں یہ تقریر کی گئی تھی)

ساتھیو! سب سے پہلے میں مشرق کے محنت کشوں کی کمیونسٹ یونیورسٹی کی چوتھی سالگرہ کے موقع پر آپ کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں تہ دل سے آپ کی کامیابی کا طالب ہوں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ مشرق کے لئے کمیونسٹ کارکنوں کو تربیت دینے کے مشکل کام میں آپ کی یونیورسٹی کو خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔

اس یونیورسٹی میں میرا آنا بہت کم ہوتا ہے حالانکہ آپ سے اکثر ملتے رہنا میرا فرض ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کام کی کثرت کی وجہ سے میرا جلد جلد آنا جانا ممکن نہیں۔ اس کے لئے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اور اب مجھے اجازت دیجئے کہ مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کے سیاسی فریضوں کے بارے میں کچھ کہوں۔

اگر ہم مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کی طالب علم جماعت کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ یہاں دو قسم کے طلبا ہیں۔ اس یونیورسٹی میں مشرق کی کم از کم پچاس قوموں اور نسلی گروہوں کے نمائندے موجود ہیں۔ اور یونیورسٹی کے طلبا سب مشرق کے ہی بچے ہیں۔ لیکن اتنا کہنے سے بات پوری اور صاف نہیں ہوتی۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کے طلبا کی دو بڑی جماعتیں ہیں جن کی نشوونما بالکل مختلف حالتوں میں ہوئی ہے۔ پہلی گروہ میں وہ لوگ ہیں جو مشرقی سوویتوں سے یہاں آئے ہیں۔ اس سرزمین سے آئے ہیں جہاں سرمایہ داروں کی حکومت کا وجود باقی نہیں رہا جہاں سے سامراج کا جوا اتار کر پھینک دیا گیا ہے اور جہاں اب مزدوروں کا اقتدار قائم ہو چکا ہے۔ طلبا کے دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو نوآبادیوں اور محکوم ملکوں سے یہاں آئے ہیں۔ جہاں ابھی تک سرمایہ داری راج کر رہی ہے۔ جہاں سامراجیت کا جبر و ظلم پوری شدت سے جاری ہے اور جہاں سامراج کا خاتمہ کر کے آزادی حاصل کرنا ابھی باقی ہے۔

اس طرح ہمارے سامنے دو مشرق ہیں جو مختلف قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور مختلف حالات میں نشوونما پا رہے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ طالب علم جماعت کی اس دوگانہ خصوصیت کا اثر مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کے کام پر بھی پڑے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس یونیورسٹی کا ایک پاؤں سوویت کی زمین پر ہے اور دوسرا پاؤں نوآبادیوں اور غلام ملکوں میں۔ اسی لئے یونیورسٹی کو دو طرح کے کام انجام دینا پڑتے ہیں۔ ایک کا مقصد ایسے کارکن تیار کرنا ہے جو مشرق کی سوویت جمہوریتوں کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں اور دوسرے کا مقصد ایسے کارکنوں کی تربیت کرنا ہے جو مشرق کی نوآبادیوں اور محکوم ملکوں کے محنت کش عوام کی انقلابی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔

اسی لئے مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کے سامنے دو قسم کے فرائض ہیں۔

آیئے، ہم ان دونوں قسم کے فریضوں کا الگ الگ جائزہ لیں۔

۱۔ مشرق کی سویت جمہوریتوں کے سلسلے میں مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کے فرائض

ان ملکوں یا ان جمہوریتوں کی زندگی اور نشوونما کی وہ کون سی خصوصیتیں ہیں جن کی بنا پر ان میں اور نوآبادیوں اور محکوم ملکوں میں فرق کیا جاسکتا ہے؟

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جمہوریتیں سامراجیت کے پنجے سے آزاد ہو گئی ہیں۔

دوسرے یہ کہ قوموں کی حیثیت سے ان کی نشوونما اور تنظیم سرمایہ دار نظام حکومت کی سرپرستی میں نہیں بلکہ سویت حکومت کی سرپرستی میں ہو رہی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

تیسرے یہ کہ صنعتی اعتبار سے ان کی بہت ہی کم ترقی ہوئی ہے۔ مگر وہ اپنی نشوونما کے لئے سویت یونین کے صنعتی مزدور طبقے کی حمایت اور امداد پر پوری طرح سے بھروسہ کر سکتی ہیں۔

چوتھے یہ کہ چونکہ وہ سامراجی جوئے سے بالکل آزاد ہیں، اور مزدور طبقے کی آمریت کی سرپرستی میں سویت یونین کی رکن ہیں اس لئے ہمارے ملک میں اشتراکیت کی تعمیر میں وہ ہماری شریک کار ہو سکتی ہیں اور انہیں ہونا چاہئے۔

اس لئے بنیادی کام ان جمہوریتوں کے مزدوروں اور کسانوں کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ ہمارے ساتھ مل کر اشتراکیت کی تعمیر کر سکیں اور ہر جمہوریت کے مخصوص حالات زندگی کے مطابق ایسی حالت پیدا کریں اور اسے ترقی دیں جس میں اس رفاقت کو تیزی سے آگے بڑھایا جاسکے۔

اس لئے مشرق کے عملی کارکنوں کے سامنے آج یہ کام ہیں:۔

(۱) مشرق کی سویت جمہوریتوں میں صنعتی مرکز قائم کرنا جن کی بنیاد پر کسانوں کو مزدور طبقے کے گرد جمع کیا جاسکے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کام شروع کر دیا گیا ہے اور سویت یونین کی معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی ترقی کرتا رہے گا۔ ان ملکوں میں تمام قسم کے کچے مال موجود ہیں۔ یہ اس امر کی ضمانت ہے کہ صنعتی تعمیر کا کام ضرور انجام پائے گا۔

(۲) زراعت اور سب سے بڑھ کر آب پاشی کو ترقی دینا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کام بھی، کم از کم ماورائے قفقاز اور ترکستان میں تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

(۳) عام کسانوں اور دستکاروں میں انجمن امداد باہمی کے کام کو سدھارنا اور آگے بڑھانا۔ مشرق کی سویت جمہوریتوں کو سویتی اقتصادی نشوونما کے عام نظام میں لے آنے کا یہی سب سے یقینی طریقہ ہے۔

(۴) سویتوں کو عوام سے قریب تر کرنا۔ بناوٹ میں (یعنی جن لوگوں سے مل کر وہ بنی ہوں ان کے اعتبار سے) انہیں قومی بنانا اور اس طرح ایک قومی سویت ریاستی تنظیم کی بنیاد ڈالنا جو محنت کش عوام سے قریب رہے اور ان کی سمجھ میں آسکے۔

(۵) قومی تہذیب کو فروغ دینا۔ عام تعلیم اور صنعتی اور پیشہ ورانہ تربیت کے لئے نصاب مقرر کرنا اور اسکولوں کا ایک جال پھیلا دینا۔ دیسی زبان میں تعلیم دینا تاکہ مقامی لوگوں

میں سے سویت، پارٹی، مزدور سبھا اور اقتصادی اداروں کے لئے کارکنوں کی تربیت کی جا سکے۔

یہی وہ کام ہیں جن کے پورا ہو جانے سے مشرق کی سویت جمہوریتوں میں اشتراکیت کی تعمیر بہت آسان ہو جائے گی۔

سویت مشرق میں لوگ جمہوریتوں کے قابل تقلید نمونے قائم کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن قابل تقلید جمہوریت کیا چیز ہے؟ قابل تقلید جمہوریت وہی ہو سکتی ہے جو اپنے کام کو سچائی اور راستبازی کے ساتھ انجام دے، اور اس طرح آس پاس کی نو آبادیوں اور محکوم ملکوں کے مزدوروں اور کسانوں میں تحریک آزادی کا ولولہ پیدا کرے۔

میں نے ابھی کہا کہ ان قوموں کے محنت کش عوام سے سویتوں کا زیادہ قریبی تعلق قائم کرنا چاہئے۔ سویتوں کو قومی رنگ دے دینا چاہئے۔ لیکن اس کے معنی کیا ہیں، اور اس کی عملی صورت کیا ہوگی؟ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی حال میں ترکستان کی سرحدوں کی جو نئی حد بندی کی گئی ہے وہ اس کی ایک عمدہ مثال ہے کہ سویتوں کو عوام سے زیادہ قریب کیسے لایا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داروں کے اخبار اس حد بندی کو "بولشویکوں کی چالبازی" سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کسی چالبازی کا نتیجہ نہیں بلکہ ترکمانستان اور ازبکستان کے عوام الناس کے اس جذبہ کا اظہار ہے کہ حکومتی ادارے ان کے اپنے ہوں، ان سے قربت رکھتے ہوں اور ایسے ہوں کہ ان کی سمجھ میں آ سکیں۔ انقلاب سے پہلے کے زمانے میں ان دونوں ملکوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیے گئے تھے، انھیں متعدد خانوں اور سلطانوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ اور وہ "ارباب اختیار" کی لوٹ کھسوٹ کا میدان بنے ہوئے تھے۔ آج اس کا وقت آ گیا ہے کہ ان منتشر ٹکڑوں کو دوبارہ یکجا کر کے آزاد ریاستیں قائم کی جائیں تاکہ ازبکستان اور ترکمانستان کے محنت کش عوام کو متحد کیا جا سکے اور حکومتی ادارے ان کے ہاتھوں میں سونپے جا سکیں۔ ترکستان کی سرحدوں کی حد بندی کرنے کا مطلب ان ملکوں کے منتشر ٹکڑوں کو دوبارہ ملا کر آزاد ریاستیں قائم کرنا ہے۔ اور اس کے بعد اگر ان ریاستوں نے مساوی حیثیت سے سویت یونین میں شریک ہونے کی خواہش کی تو اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ بالشویکوں نے مشرق کے عوام کی دلی تمناؤں کو پورا کرنے کا گُر معلوم کر لیا ہے اور سویت یونین ہی دنیا میں مختلف قوموں کے محنت کش عوام کے رضاکارانہ اتحاد کی واحد شکل ہے۔ پولستان کو پھر سے متحد کرنے کے لئے سرمایہ داروں کو کئی بار جنگ کرنی پڑی۔ مگر ترکمانستان اور ازبکستان کو پھر سے متحد کرنے کے لئے کمیونسٹوں کو محض چند مہینے تک تشریح و تبلیغ کی ضرورت پڑی۔

نظم و نسق کے اداروں یعنی موجودہ صورت میں سویتوں کو مختلف قوموں کے محنت کش عوام سے نزدیک لانے کا یہی طریقہ ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ صرف بالشویکوں کی قومی پالیسی ہی ایک صحیح پالیسی ہے۔

میں نے مشرق کی سویت جمہوریتوں میں قومی تہذیب کے معیار کو بلند کرنے کی بات بھی کہی تھی۔ لیکن قومی تہذیب کسے کہتے ہیں؟ مزدور تہذیب کے ساتھ اس کا نباہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا لینن نے جنگ سے پہلے ہی یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ دنیا میں دو تہذیبیں ہیں: سرمایہ دار تہذیب اور اشتراکی تہذیب۔ اور قومی تہذیب کا مطالبہ سرمایہ داروں کا ایک رجعت پسند مطالبہ ہے، جو چاہتے ہیں کہ مزدوروں کے دماغ میں قومیت کا زہر سرایت کر جائے۔ ایک طرف قومی تہذیب کی نشو و نما، دیسی زبانوں میں نئے نئے اسکولوں کا قیام اور نصاب تعلیم کی تیاری، اور مقامی باشندوں میں سے کمیونسٹ کارکنوں کی تربیت

اور دوسری طرف اشتراکیت کی تعمیر اور مزدور تہذیب کی نشوونما، ان دونوں میں مطابقت کیسے پیدا کی جا سکتی ہے؟ کیا ان میں کوئی ایسا تضاد نہیں جو کبھی دور نہ ہو سکے؟ ہرگز نہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہم ایک مزدور تحریک کی نشوونما کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ مزدور تہذیب جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے اشتراکی ہے، ان مختلف قوموں میں جو اشتراکی تعمیر کے کام میں کھنچ آئی ہیں، اپنے اظہار کے لئے مختلف صورتیں اور طریقے اختیار کر لیتی ہے۔ اس کا انحصار زبان، رسم و رواج وغیرہ کے اختلافات پر ہوتا ہے۔ اپنی ماہیت میں مزدور اور صورت میں قومی! یہ ہے وہ عالمگیر انسانی تہذیب جس کی طرف اشتراکیت بڑھتی جا رہی ہے۔ مزدور تہذیب قومی تہذیب کے منافی نہیں بلکہ وہ اس میں ایک نئی جان ڈالتی ہے۔ دوسری طرف قومی تہذیب مزدور تہذیب کے منافی نہیں بلکہ اسے ایک قالب عطا کرتی ہے۔ قومی تہذیب کا مطالبہ اسی وقت تک سرمایہ دارانہ مطالبہ تھا جب تک کہ سرمایہ دار برسر اقتدار تھے اور قوموں کی تنظیم سرمایہ داری نظام کے ماتحت ہو رہی تھی۔ لیکن جب مزدور طبقہ برسر اقتدار آ گیا تو قومی تہذیب کا مطالبہ بھی مزدور طبقے کا مطالبہ بن گیا کیونکہ اب قوموں کی تنظیم سوویت حکومت کی سرپرستی میں ہونے لگی ہے۔ جو کوئی ان دونوں صورت حال کے بنیادی فرق کو نہیں سمجھ سکتا ہے وہ لینن ازم کو یا لینن ازم کے نقطہ نظر سے قومی مسئلے کی اصل حقیقت کو قیامت تک نہیں سمجھ سکے گا۔

٣٥ـ لینن ازم یعنی بیسویں صدی میں مزدور طبقے کے سب سے بڑے رہنما لینن کی تعلیمات۔ لینن کی تعلیمات سراسر مارکسیت پر مبنی ہیں اور اس نے جدید سامراجیت اور خصوصاً مزدور انقلاب کے حالات میں مارکسیت کو مزید ترقی دی اور آگے بڑھایا ہے۔ لینن ازم کی تفصیلی بحث استالین کی دوسری کتاب "لینن ازم کی اساس" میں ملے گی۔ جس کا اردو ترجمہ قومی دارالاشاعت، بمبئی سے شائع ہو چکا ہے۔

بعض لوگوں (جیسے کاٹسکی[٣٦]) کا کہنا ہے کہ اشتراکیت کے دور میں ایک ہی عالمگیر زبان قائم ہو گی اور دوسری تمام زبانیں مٹ جائیں گی۔ مجھے ایک ہی ہمہ گیر زبان کے اس نظریہ پر مطلق بھروسہ نہیں۔ تجربہ کم از کم اس نظریہ کے خلاف ہے۔ ابھی تک تو صورت حال یہ رہی ہے کہ اشتراکی انقلاب کی وجہ سے زبانوں کی تعداد میں کمی نہیں بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ کیونکہ انقلاب انسانیت کی اندرونی گہرائیوں میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ جن قوموں کا نام لوگوں نے بالکل سنا ہی نہ تھا یا بہت کم لوگوں نے سنا تھا انہیں سیاست کے میدان میں کھینچ لاتا اور ان میں نئی زندگی اور بیداری پیدا کرتا ہے۔ کسے خبر تھی کہ قدیم زاری روس میں کم از کم پچاس قومیں اور نسلیں آباد ہیں؟ لیکن اکتوبر کے انقلاب نے پرانی زنجیروں کو توڑ ڈالا اور بہت سی بھولی بسری قوموں اور لوگوں کو منظر عام پر لا کھڑا کر دیا اور انہیں نئی زندگی اور نئی نشوونما کے موقع عطا کئے۔ آج کل ہندوستان کا ذکر کچھ اس طرح کیا جاتا ہے گویا وہ ایک سالم چیز ہے۔ لیکن اس میں مطلق شک نہیں کہ انقلابی اتھل پتھل کے دنوں میں ہندوستان میں بھی بہت سی قومیں جن کو اب تک لوگ جانتے تک نہیں، اپنی اپنی زبان اور اپنی مخصوص تہذیب لئے اٹھ کھڑی ہوں گی اور جہاں تک مزدور تہذیب میں مختلف قوموں کی شرکت کا سوال ہے اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ شرکت ایسی شکلیں اختیار کرے گی جو ان قوموں کی زبان اور ان کے رسم و رواج کے مطابق ہو۔

٣٦ـ مارکس اور اینگلز کے بعد انیسویں صدی میں کاٹسکی بین الاقوامی مزدور طبقے کا ایک ممتاز رہنما تھا لیکن آگے چل کر مارکسیت کے اصلی راستے سے گمراہ ہو کر موقع پرستی اور بالآخر انقلاب دشمنی کے گڑھے میں جا گرا۔ روس میں اکتوبر کے انقلاب کے بعد اس نے مزدور طبقے کی آمریت کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا۔ لینن نے اس کے خلاف ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام تھا "غدار کاٹسکی"۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ مجھے بوریات سے چند ساتھیوں کا خط ملا تھا جس میں انھوں نے مجھ سے عالمگیر تہذیب اور قومی تہذیب کے باہمی تعلق کے بارے میں صراحت چاہی تھی۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"ہماری استدعا ہے کہ آپ ذیل کے سوال کی مفصل تشریح کریں، جو ہمارے لئے بہت اہم اور مشکل ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا آخری مقصد ایک عالمگیر تہذیب قائم کرنا ہے۔ لیکن اس وقت ہماری مختلف خود مختار جمہوریتوں میں قومی تہذیب کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اس سے ہم عالمگیر تہذیب کی منزل تک کیسے پہنچ سکیں گے؟ مختلف قوموں کی خصوصیات (زبان وغیرہ) مل کر ایک کیسے ہو جائیں گی۔"

میں سمجھتا ہوں کہ ابھی جو کچھ کہا گیا وہی اس سوال کا بھی جواب ہے جو ہمارے بریاتی ساتھیوں کو پریشان کر رہا ہے۔

بریاتی ساتھیوں کا سوال ہے کہ ایک عالمگیر مزدور تہذیب کی نشوونما کے دوران میں مختلف قومیں ایک دوسرے میں کیسے جذب ہو جائیں گی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض قومیں شاید اور بعض قومیں یقینی طور پر دوسروں میں جذب ہو جائیں گی۔ ایسا پہلے بھی ہوا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بعض قوموں کا جذب ہو جانا اس امر کا منافی نہیں بلکہ اس کی دلیل ہے کہ بعض طاقتور قومیں مزید تقویت اور نشوونما پائیں گی۔ کیونکہ جذب ہونے کا عمل دراصل قوموں کی نشوونما کے مجموعی عمل کا نتیجہ اور اسی کا ایک جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الگ الگ قوموں کے جذب ہونے کا امکان اس خیال کو جو بالکل صحیح خیال ہے، کمزور نہیں بلکہ اس کی تصدیق کرتا ہے کہ عالمگیر مزدور تہذیب قومی تہذیب کی منافی نہیں بلکہ اس کو تسلیم کر کے آگے بڑھتی اور اس کو ترقی دیتی ہے، جیسا کہ خود قومی تہذیب عالمگیر مزدور تہذیب کی منافی نہیں بلکہ اس میں رنگ بھرتی اور اسے اور بھی زیادہ سرسبز و شاداب کرتی ہے۔

مشرق کی سوویت جمہوریتوں کے عملی کارکنوں کے سامنے بحیثیت مجموعی آج یہی فرائض ہیں، یہی ان فرائض کی نوعیت اور ان کا لُب لباب ہے۔

زبردست اقتصادی ترقی اور کسانوں کو نئی مراعات دینے کا جو دور شروع ہوا ہے اس کی بنیاد پر ان کاموں کو جلد جلد پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور اس طرح مشرق کی سوویت جمہوریتوں کی جو اصل میں کسانوں کا ملک ہیں، مدد کرنی چاہئے تاکہ وہ سوویت یونین میں اشتراکیت کی تعمیر میں ہمارے ساتھ کام کر سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ کسانوں کو پارٹی کی نئی پالیسی کی رو سے جو رعایتیں (زمین کا عارضی ٹھیکہ، اجرت پر مزدوروں سے کام لینے کی اجازت وغیرہ) دی گئی ہیں، ان میں کئی قدم ایسے ہیں جو پیچھے لے جاتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟ ہاں، سچ ہے۔ لیکن یہ پیچھے لے جانے والے قدم ایسے ہیں جن کی اجازت ہم نے جان بوجھ کر دی ہے۔ تمام بڑی بڑی قوتیں آج پارٹی اور سوویت حکومت کے ہاتھ میں ہیں۔ آج سکہ پائیدار حالت میں ہے۔ صنعت اور ذرائع نقل و حمل ترقی کر رہے ہیں اور قرضے کے لین دین کا انتظام دن بدن بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ آج مناسب شرطوں پر قرضہ دے کر بلا کسی طرح کے خلل کے، آبادی کی کسی جماعت کو بنایا بگاڑا جا سکتا ہے۔ یہ تمام حربے مزدور آمریت کے ہاتھ میں محفوظ ہیں اور اگر ان کی موجودگی میں محاذ کے کسی حصہ پر چند قدم پیچھے ہٹائے جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ سارے محاذ پر ایک عام حملہ کی تیاری کی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اس وقت پارٹی نے کسانوں کو کچھ نئی رعایتیں دی ہیں تو اس کی بدولت کسان ہمارے ساتھ مل کر اشتراکیت کی تعمیر کرنا ترک نہیں کریں گے بلکہ زیادہ آسانی سے اس کام کو اختیار کریں گے۔

یہ صورت حال مشرق کی سویت جمہوریتوں کے لئے کون سی اہمیت رکھتی ہے؟

اس کی اہمیت یہی ہو سکتی ہے کہ ایک نیا حربہ ان جمہوریتوں کے عملی کارکنوں کے ہاتھ آگیا ہے جس کے ذریعے سے وہ بہ آسانی اور زیادہ تیزی کے ساتھ ان ملکوں کو سویت کی اقتصادی نشوونما کے عام نظام سے منسلک کر سکتے ہیں۔

دیہاتی ملکوں میں پارٹی کی پالیسی اور سویتی مشرق کے عملی کارکنوں کے فوری فرائض میں یہی تعلق ہے۔

اس سلسلے میں، مشرق کی سویت جمہوریتوں کے متعلق مشرق کی قوموں کی یونیورسٹی کا فرض یہ ہے کہ ان جمہوریتوں کے لئے کارکنوں کی تربیت کرے۔ تربیت اس طرح ہونی چاہئے کہ ابھی جو فوری کام بتائے گئے ہیں ان کی تکمیل کا پورا یقین ہو جائے۔

مشرق کے لوگوں کی یونیورسٹی اپنے کو زندگی سے الگ نہیں کر سکتی۔ یہ کوئی ایسا ادارہ نہیں اور نہ اسے ہونا چاہئے جو زندگی سے الگ تھلگ کھڑا ہو۔ اس کے جسم کے ایک ایک رگ ریشہ کو حقیقی زندگی سے وابستہ ہونا چاہئے۔ اس لئے آج مشرق کی سویت جمہوریتوں کے سامنے جو کام ہیں ان سے یہ یونیورسٹی بے تعلق نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریتوں کے لئے کارکنوں کی تربیت کرتے وقت یونیورسٹی کا فرض ہے کہ ان جمہوریتوں کے فوری فرائض کو پوری طرح دھیان میں رکھے۔

سویتی مشرق میں کام کرتے ہوئے عملی کارکن دو کجرویوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اگر سویتی مشرق کے لئے سچے کارکنوں اور سچے انقلابیوں کی تربیت کرنی ہے تو اسی یونیورسٹی کی چہار دیواری کے اندر ان کجرویوں کی اصلاح ہو جانی چاہئے۔

پہلی کجروی یہ ہے کہ میں نے ابھی جو کام بتائے ان کو لوگ بہت ہی سہل سمجھ لیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ معاشی ترقی کی وہ شکلیں جو سویت یونین کے مرکزی علاقوں میں قابلِ فہم اور عملاً ممکن ہیں، سرحدی علاقوں میں بھی آنکھ بند کرکے اور ہو بہو اختیار کر لی جائیں۔ حالانکہ ان علاقوں میں نشوونما کا جو حال ہے، اس میں ان پر عمل کرنا قطعی ناممکن ہے۔ جو ساتھی اس کجروی کے مرتکب ہوتے ہیں وہ دو باتوں کو نہیں سمجھ سکے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مرکز میں اور "سرحدی علاقوں" میں حالات یکساں نہیں ہیں۔ دونوں کی حالتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ مشرق کی سویت جمہوریتیں خود آپس میں ایک سی نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض مثلاً جارجیا اور آرمینیا قومی سالمیت (یعنی منتشر اجزا کا مل کر ایک قوم بننا۔ مترجم) کی اعلیٰ منزل پر پہونچ گئی ہیں۔ بعض مثلاً چیچنیا اور کبارڈا ابھی قومی سالمیت کی ابتدائی منزل پر ہیں۔ پھر بعض جمہوریتیں مثلاً کرغزستان کی حالت ان دونوں کے بین بین ہے۔ یہ ساتھی یہ نہیں سمجھتے کہ اگر ہم نے کام میں مقامی حالتوں سے مناسبت نہیں پیدا کی، اگر ہم نے ہر ملک کی ہر خصوصیت کو نظر کے سامنے نہیں رکھا تو ہم کوئی ٹھوس اور پائیدار چیز نہیں بنا سکیں گے۔ اس کجروی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ عوام سے دور جا پڑتے اور صرف انتہا پسندی کے نعرے لگانے لگتے ہیں۔ اس لئے اس یونیورسٹی کا کام ایسے کارکن تیار کرنا ہے جو اس سہل انگاری کے خلاف سختی سے جہاد کر سکیں۔

دوسری کجروی اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ مقامی خصوصیتوں پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ لوگ اس مشترکہ اور بنیادی چیز کو بھول جاتے ہیں جو سویت یونین کے صنعتی علاقوں سے ان مشرقی جمہوریتوں کا تعلق قائم کرتی ہے۔ اشتراکی فریقوں کو

نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اور ایک تنگ اور محدود قومیت کے مقاصد کے مطابق اپنی پالیسی میں کاٹ چھانٹ کی جاتی ہے۔ جو ساتھی اس کجروی کے مرتکب ہوتے ہیں انھیں اپنے ملک کی اندرونی ترقی کی زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ وہ اس نشوونما کو واقعات کی قدرتی رفتار پر چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے اہم تجویز اندرونی نشوونما نہیں "غیرملکی" سیاست ہے، اپنی جمہوریت کی سرحدیں بڑھانا ہمسایہ جمہوریتوں سے مقدمہ بازی کرنا، اپنے ہمسایوں کے علاقے دبا لینا، اور اس طرح اپنے ملک کے سرمایہ دار قوم پرستوں کی نظر میں سرخروئی حاصل کرنا ان کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس کجروی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اشتراکیت سے دور جا پڑتے اور تنزلی کر کے معمولی قسم کے سرمایہ پرست قوم پرست بن جاتے ہیں۔ مشرق کے عوام کی یونیورسٹی کو ایسے کارکن تیار کرنے چاہئیں جو اس پوشیدہ قوم پرستی کے خلاف سختی سے جدوجہد کر سکیں۔

مشرق کی سوویت جمہوریتوں کے سلسلے میں مشرق کے عوام کی یونیورسٹی کے فرائض یہی ہیں۔

۲۔ مشرق کے غلام ملکوں اور نوآبادیوں کے سلسلے میں مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کے فرائض

اب ہم دوسرے سوال پر آتے ہیں۔ مشرق کی نوآبادیوں اور محکوم ملکوں کے سلسلے میں مشرق کے محنت کشوں کی یونیورسٹی کے فرائض کیا ہیں؟

ان ملکوں کی زندگی اور نشوونما کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟ ان میں اور مشرق کی سوویت جمہوریتوں میں فرق کیا ہے؟

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ملک سامراجیت کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی غلامی میں ان کی نشوونما ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ ان کی گردن پر دوہرا جوا رکھا ہوا ہے۔ ایک اندرونی (خود اپنے سرمایہ داروں کا) اور دوسرا بیرونی (غیرملکی سامراجی سرمایہ داروں کا)۔ اور اس دوہرے بوجھ سے ان ملکوں میں انقلابی بحران زیادہ شدید اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔

تیسرے، ان میں سے بعض ملکوں مثلاً ہندستان میں سرمایہ داری تیزی سے بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے کم و بیش کثیر تعداد میں ایک دیسی مزدور طبقہ پیدا ہو رہا اور منظم

شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔

چوتھے، انقلابی تحریک جیسے جیسے بڑھ رہی ہے ان ملکوں کا قومی سرمایہ دار طبقہ دو حصوں میں بٹتا جا رہا ہے۔ ایک انقلابی حصہ (یعنی ٹٹ پونجیہ یا متوسط سرمایہ دار) اور دوسرا مصالحت پسند (بڑے بڑے سرمایہ دار)۔ پہلا گروہ انقلابی جدوجہد کو جاری رکھتا ہے اور دوسرا سامراجیت سے مل جاتا ہے۔

پانچویں، ان ملکوں میں سامراجی محاذ کے علاوہ ایک اور محاذ قائم ہوتا ہے۔ یہ مزدوروں اور انقلابی متوسط طبقہ کا سامراج دشمن متحدہ محاذ ہے جس کا مقصد سامراجیت سے مکمل آزادی حاصل کرنا ہے

چھٹے، ان ملکوں میں مزدور طبقہ کی قیادت کا مسئلہ، اور عوام کو مصالحت پسند قومی سرمایہ داروں کے اثر سے آزاد کرنے کا مسئلہ روز بروز زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے۔

ساتویں، مذکورہ بالا آخری خصوصیت کی وجہ سے یہ بآسانی ممکن ہو جاتا ہے کہ ان ملکوں کی قومی تحریک آزادی کو مغرب کے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کی مزدور تحریک سے متحد کیا جا سکے۔

اس سے کم از کم تین نتیجے نکلتے ہیں۔

۱۔ ایک کامیاب انقلاب کے بغیر نوآبادیوں اور محکوم ملکوں کو سامراجیت سے آزادی ملنا ممکن نہیں۔ آزادی کبھی مفت نہیں ملا کرتی ہے۔

۲۔ جن نوآبادیوں اور محکوم ملکوں میں سرمایہ داری کی ترقی ہو چکی ہے وہاں اس وقت تک انقلاب آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ آزادی حاصل ہو سکتی ہے جب تک کہ مصالحت پسند سرمایہ داروں کو الگ نہ کر دیا جائے، جب تک کہ متوسط طبقہ کے انقلابی عوام

ان سرمایہ داروں کے اثر سے آزاد نہ کرائے جائیں، جب تک کہ مزدور طبقے کی قیادت نہ قائم ہو جائے اور جب تک کہ مزدور طبقے کے سب سے آگے بڑھے ہوئے عناصر ایک آزاد کمیونسٹ پارٹی میں منظم نہ ہو جائیں۔

۳۔ نوآبادیوں اور محکوم ملکوں میں اس وقت تک مستقل فتح نہیں حاصل ہو سکتی جب تک کہ ان ملکوں کی تحریک آزادی کو مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں کی مزدور تحریک سے متحد نہ کر دیا جائے۔

نوآبادیوں اور محکوم ملکوں کے کمیونسٹوں کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ انہی اصولوں پر اپنے انقلابی کام کی بنیاد رکھیں۔ اس صورت میں نوآبادیوں اور محکوم ملکوں کی انقلابی تحریک کے فوری فرائض کیا ہیں؟

اس وقت نوآبادیوں اور محکوم ملکوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اب کسی ایک اور ہمہ گیر محکوم مشرق کا وجود نہیں رہا۔ کچھ دن پہلے تک لوگ محکوم مشرق کو ایک چیز اور ایک ہی قسم کی چیز سمجھتے تھے۔ لیکن آج یہ نقشہ بالکل غلط ہو گیا ہے۔ اس وقت دنیا میں کم از کم تین قسم کی نوآبادیاں اور محکوم ملک ہیں۔ اول مراکش جیسے ملک ہیں جہاں مزدور طبقہ کا وجود بالکل نہیں ہے یا قریب قریب نہیں کے برابر ہے۔ اور جنھوں نے صنعتی اعتبار سے بالکل ترقی نہیں کی۔ دوسرے، چین اور مصر جیسے ملک ہیں جنھوں نے صنعتی اعتبار سے بہت کم ترقی کی ہے اور جہاں مزدوروں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ تیسرے ہندوستان جیسے ملک ہیں، جہاں کم و بیش سرمایہ داری کی نشوونما ہو چکی ہے اور جہاں ملکی مزدوروں کا طبقہ کافی بڑی تعداد میں موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ ان تمام ملکوں کو ایک ہی قسم کی نوآبادی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

مراکش جیسے ملکوں میں ابھی اس کی گنجائش نہیں کہ قومی سرمایہ دار طبقہ پھوٹ کر دو متضاد یعنی انقلابی اور مصالحت پسند جماعتوں میں تقسیم ہوسکے۔ اس لئے وہاں کمیونسٹ عناصر کا کام اس بات کی پوری کوشش کرنا ہے کہ سامراجیت کے خلاف ایک متحدہ قومی محاذ قایم ہوسکے۔ سامراج دشمن جدوجہد کے دوران میں، اور خصوصاً سامراجیت کے خلاف ایک کامیاب انقلابی جنگ کے بعد ہی یہ ممکن ہوسکے گا، ان ملکوں کے کمیونسٹ عناصر الگ ہو کر اپنی ایک کمیونسٹ پارٹی قائم کریں۔

مصر اور چین جیسے ملکوں میں ملکی سرمایہ داروں کی صف میں پھوٹ پڑ چکی ہے۔ وہ ایک انقلابی پارٹی اور ایک مصالحت پسند پارٹی میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ لیکن وہاں کے سرمایہ داروں کا مصالحت پسند حصہ ابھی تک سامراجیت سے متحد نہیں ہو سکا ہے۔ ان ملکوں میں سامراجیت کے خلاف ایک متحدہ قومی محاذ قائم کرنا کمیونسٹوں کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ ان ملکوں میں کمیونسٹوں کا فرض اب یہ ہے کہ ایک متحدہ قومی محاذ کی پالیسی ترک کر کے مزدوروں اور متوسط طبقہ کا انقلابی محاذ قائم کرنے کی پالیسی اختیار کریں۔ ان ملکوں میں یہ محاذ مزدوروں اور کسانوں کی ایک متحدہ پارٹی کی شکل اختیار کر سکتا ہے، جیسا کہ چین میں کومن تانگ ہے۔ لیکن اس کی ایک بنیادی شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ خاص قسم کی پارٹی حقیقت میں ان دونوں قوتوں یعنی کمیونسٹ پارٹی اور انقلابی متوسط طبقے کی پارٹی کے اتحاد کی نمائندگی کرتی ہو۔ اس محاذ کا کام یہ ہے کہ قومی سرمایہ داروں کی مصالحت پسند ذہنیت اور اس کے بے اصولی پن کا پردہ چاک کرے اور سامراجیت کے خلاف نہایت سختی سے جدوجہد کرے۔ اس قسم کی مخلوط پارٹی اس وقت تک ضروری اور مفید ثابت ہو گی جب تک اس سے کمیونسٹ پارٹی کی آزادی میں کوئی فرق نہ آئے، جب تک وہ کمیونسٹ پارٹی کی تحریک کی قیادت کرنے کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی نہ عائد کرے۔ جب تک وہ مزدور طبقہ کو کمیونسٹ پارٹی کے پرچم تلے جمع ہونے سے نہ روکے اور جب تک کہ کمیونسٹ پارٹی کو انقلابی تحریک کی عملی رہنمائی کرنے میں اس سے مدد ملتی رہے۔ اگر اس قسم کی مخلوط پارٹی یہ ضرورتیں پوری نہیں کرتی تو وہ بیکار بھی ہے اور مصلحت کے خلاف بھی۔ کیونکہ اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ کمیونسٹ عناصر سرمایہ داروں کی جماعت میں تحلیل ہو جائیں گے اور کمیونسٹ پارٹی اپنے مزدور لشکر سے محروم ہو جائے گی۔

ہندستان جیسے ملکوں میں صورت حال کسی قدر مختلف ہے۔ ہندستان جیسے محکوم ملکوں کے حالات زندگی کی بنیادی اور نئی خصوصیت صرف یہی نہیں کہ ملکی سرمایہ داروں کی صف میں پھوٹ پیدا ہو گئی ہے اور وہ انقلابی اور مصالحت پسند گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ سرمایہ داروں کی مصالحت پسند جماعت، سامراجیت سے عام طور سے سمجھوتہ کر چکی ہے۔ وہ سامراجیت کے مقابلے میں انقلاب سے زیادہ ڈرتی ہے، اسے اپنے ملک کے مفاد سے زیادہ اپنی تھیلی کی فکر ہے۔ سرمایہ داروں کا یہ گروہ جو نہایت ہی دولت مند اور بااثر ہے کمل طور سے انقلاب کے بدترین دشمنوں کے گروہ میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے ملک کے مزدوروں اور کسانوں کے خلاف سامراجیت سے مل کر ایک محاذ قائم کر لیا ہے۔ انقلاب کو اس وقت تک فتح نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ محاذ توڑ پھوڑ کر ختم نہ کر دیا جائے۔ لیکن اس محاذ کو توڑنے کے لئے ضروری ہے کہ مصالحت پسند ملکی سرمایہ داروں پر گولیوں کی بوچھار کی جائے، ان کی دغابازی کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے، محنت کش عوام کو ان کے اثر سے رہا کیا جائے اور مزدور طبقہ کی قیادت قائم کرنے کے لئے ضروری حالات پیدا کرنے کی باقاعدہ کوشش کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہندستان جیسے محکوم ملکوں میں اصل کام،

تحریک، آزادی کی قیادت کے لئے مزدور طبقے کو تیار کرنا اور سرمایہ داروں اور ان کے نمائندوں کو بتدریج اس قابلِ فخر مقام سے گرانا انہیں تحریکِ آزادی کی رہنمائی سے برطرف کرنا ہے۔ غرضکہ ایک انقلابی سامراج دشمن محاذ تیار کرنا اور اس محاذ کے اندر مزدور طبقے کی قیادت قائم کرنا ہے۔ یہ محاذ ایک مشترکہ پروگرام کی بنیاد پر ایک متحدہ مزدور اور کسان پارٹی کی صورت اختیار کر سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ اور ہر حال میں ایسا ہی ہو۔ ان ملکوں میں ترقی یافتہ کمیونسٹ عناصر کا بنیادی نعرہ کمیونسٹ پارٹی کی آزادی ہے کیونکہ کمیونسٹ پارٹی ہی مزدور طبقے کی قیادت کے لئے مناسب حالات پیدا کر سکتی ہے اور اسے قائم کر سکتی ہے۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی کو سرمایہ داروں کے انقلابی بازو سے مل کر ایک وسیع محاذ قائم کرنا ضروری ہے تاکہ مصالحت پسند سرمایہ داروں کو الگ کر دینے کے بعد وہ سامراج دشمن جدوجہد میں شہری اور دیہاتی متوسط طبقے کے کثیر التعداد عوام کی رہنمائی کر سکے۔

اس لئے جن نوآبادیوں اور محکوم ملکوں میں سرمایہ داروں کی نشوونما ہو گئی ہے وہاں انقلابی تحریک کے سامنے فوری کام یہ ہیں:

۱۔ مزدور طبقے کے بہترین عناصر کو کمیونزم کی طرف لانا اور آزاد کمیونسٹ پارٹیاں قائم کرنا۔

۲۔ مصالحت پسند ملکی سرمایہ داروں اور سامراج کے متحدہ محاذ کے مقابلہ میں مزدوروں کسانوں اور انقلابی تعلیم یافتہ جماعت کا ایک قومی انقلابی محاذ قائم کرنا۔

۳۔ اس محاذ میں مزدور طبقے کی قیادت کرنا۔

۴۔ مصالحت پسند ملکی سرمایہ داروں کے اثر سے شہری اور دیہاتی متوسط طبقے کو آزاد کرانے کی کوشش کرنا۔

۵۔ قومی تحریک آزادی اور ترقی یافتہ ملکوں کی مزدور تحریک میں اتحاد قائم کرنا۔

مشرق کی نوآبادیوں اور محکوم ملکوں کے عملی کارکنوں کے سامنے اس وقت یہ تین قسم کے فوری کام ہیں۔

ان فرائض پر اگر موجودہ بین الاقوامی صورت حال کی روشنی میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اس وقت بین الاقوامی حالات کی صورت یہ ہے کہ انقلابی تحریک عارضی طور سے سرد پڑ گئی ہے۔ لیکن اس وقت تحریک کے سرد پڑ جانے سے سبب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ مغرب کے مزدوروں پر، مشرق کی تحریکوں پر اور خاص کر سوویت یونین پر جو تمام ملکوں میں انقلابی تحریک کا علمبردار ہے، اور بھی سختیاں کی جائیں گی۔ اس میں مطلق شک نہیں کہ دنیا کے سامراجیوں نے سوویت یونین پر اس طرح کا دباؤ ڈالنے کے لئے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ استھونیہ کی بغاوت کے سلسلے میں سوویت یونین کے خلاف افترا پردازی کی ایک مہم شروع کر دی گئی ہے۔ صوفیہ میں بم پھٹنے کے حادثہ کا الزام سوویت یونین پر لگایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ دار اخبارات ہمارے ملک کے خلاف عام پروپگنڈہ کر رہے ہیں۔ یہ سب در اصل حملہ کی تیاریاں ہیں۔ ہمارے خلاف گالیوں کی یہ بوچھار ایک رائے عامہ تیار کرنے کی غرض سے ہو رہی ہے۔ عام لوگوں کو اس طرح سوویت یونین پر حملے کا عادی بنایا جا رہا ہے۔ سوویت یونین میں مداخلت کرنے کے لئے اخلاقی فضا پیدا کی جا رہی ہے۔ اس افترا اور بہتان کا نتیجہ کیا ہوگا اور سامراجی سچ مچ حملہ کرنے پر اتر آئیں گے یا نہیں، اس کا جواب زمانہ دے گا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ نوآبادیوں کے حق میں

قومی مسئلہ

یوگوسلاف کمیشن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ کامریڈ سیمیک قومی مسئلہ کو فی الحقیقت کسانوں کا مسئلہ تصور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے"۔

کیا یہ خیال صحیح ہے؟

کامریڈ سیمیک نے یوگوسلاف کمیشن میں حسب ذیل باتیں کہی تھیں۔ اسے پڑھ کر آپ خود فیصلہ کریں کہ ان کا مفہوم کیا تھا۔

"یوگوسلاویہ میں قومی تحریک کا سماجی مفہوم کیا ہے؟" کامریڈ سیمیک اس کی یوں تشریح کرتا ہے "آج یہاں ایک طرف سرب سرمایہ دار ہیں اور دوسری طرف کروٹ اور سلاوین قوم کے سرمایہ دار ہیں۔ ان میں زبردست مقابلہ اور کشمکش ہے۔ قومی تحریک کا سماجی مفہوم ان کی اسی باہمی جدوجہد میں پوشیدہ ہے"۔

اس میں مطلق شک نہیں کہ سلاوین، کروٹ اور سرب سرمایہ داروں کی باہمی جدوجہد کا اس تحریک پر کسی قدر اثر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی واضح ہو سکتا ہے کہ جو لوگ قومی تحریک کے سماجی مفہوم کو مختلف قوموں کے سرمایہ داروں کی باہم گر

جدوجہد میں پوشیدہ سمجھتے ہیں وہ قومی مسئلہ کو کسانی مسئلہ قرار نہیں دے سکتے۔ اس وقت قومی مسئلہ کی اصلیت کیا ہے جب کہ یہ مسئلہ ایک مقامی مسئلہ، ریاست کے اندرونی مسئلے سے ایک عالمگیر مسئلہ میں، سامراج کے خلاف محکوم اور دست نگر اقوام کے جدوجہد کے مسئلے میں تبدیل ہو گیا ہے؟ آج قومی مسئلہ کی اصلیت سامراجی سرمایہ داروں اور حاکم قوموں کے مالیاتی استحصال، سیاسی تسلط اور آقائی اور ان کی لائی ہوئی تہذیبی بربادی اور انتشار کے خلاف محکوم اور دست نگر اقوام کی جدوجہد میں پوشیدہ ہے۔ اگر قومی مسئلے کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مختلف قوموں کے سرمایہ داروں کی باہمی جدوجہد کی کیا اہمیت باقی رہتی ہے؟ یقیناً اس کی کوئی فیصلہ کن اہمیت نہیں ہے، اور بعض حالات میں تو اس کی مطلق اہمیت نہیں ہے۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ایک قوم کے سرمایہ دار دوسری قوم کے سرمایہ داروں کو مقابلے کے دوران میں تباہ و برباد کر دیں گے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ حاکم قوم کا سامراجی گروہ غلام اور دست نگر اقوام کے محنت کش اور خصوصاً کسان عوام کا استحصال اور ان پر ہر قسم کا جور و ظلم کر رہا ہے، اس کے اس جور و ظلم اور استحصال کی بنا پر یہ محکوم و دست نگر قومیں سامراج دشمن جدوجہد میں شریک ہو رہی ہیں اور اس طرح سے پرولتاری تحریک انقلاب کی حامی، دوست اور مددگار بن رہی ہیں۔ اگر قومی تحریک کا سماجی مفہوم مختلف قوموں کے سرمایہ داروں کا باہمی مقابلہ قرار دیا جائے تو قومی مسئلہ کسانی مسئلہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح اس کے برعکس، اگر قومی مسئلہ فی الواقعی کسانی مسئلہ قرار دیا جائے تو ہم قومی مسئلہ کا سماجی مفہوم مختلف قوموں کے سرمایہ داروں کے باہمی مقابلہ میں نہیں ڈھونڈ سکتے۔ ان دونوں دعووں کا مطلب ایک قرار دینا بالکل غلط ہے۔

کامریڈ سیمیک نے استالین کی ایک تصنیف (مطبوعہ ۱۹۱۳ء) "مارکسیت اور قومی مسئلہ" کی اس عبارت کا حوالہ دیا ہے: "قومی جدوجہد ۔ ۔ ۔ ۔ سرمایہ دار طبقہ کی باہمی جدوجہد ہے۔" اس کے ذریعے کامریڈ سیمیک یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ موجودہ عہد تاریخ میں قومی مسئلہ کا جو سماجی مفہوم اس نے بیان کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن استالین کی یہ کتاب سامراجی جنگ سے پہلے لکھی گئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ مارکسیوں کے نزدیک قومی مسئلہ نے ایک عالمگیر مسئلہ کی شکل و صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اس وقت مارکسی عناصر خود اپنے بنیادی مطالبہ حق خود اختیاری کو پرولتاری انقلاب کا جزو نہیں بلکہ سرمایہ دار جمہوری انقلاب کا جزو تصور کرتے تھے۔ لیکن آج اس حقیقت کو نظرانداز کرنا حماقت ہے کہ بین الاقوامی صورت حال میں ایک بنیادی تبدیلی آگئی ہے۔ ایک طرف سامراجی جنگ اور دوسری طرف روس کے انقلاب اکتوبر نے قومی مسئلہ کی نوعیت تبدیل کردی ہے۔ اب یہ مسئلہ سرمایہ دار جمہوری انقلاب کا جزو نہیں بلکہ سوشلسٹ مزدور انقلاب کا جزو بن گیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں مسئلہ حق خود اختیاری پر بحث کرتے ہوئے لینن نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ حق خود اختیاری اب عام جمہوری تحریک کا جزو باقی نہیں رہا ہے بلکہ سوشلسٹ مزدور انقلاب کا ایک خاص جزو بن گیا ہے۔ استالین نے اپنی کتاب سرمایہ دار جمہوری انقلاب روس کے دور میں لکھی تھی۔ یہ دور ختم ہوگیا ہے۔ اور اب نئے تاریخی حالات کی بنا پر ہم لوگ ایک نئے دور (مزدور انقلاب کے دور) میں داخل ہوگئے ہیں۔ اس وقت کامریڈ سیمیک استالین کی تحریر کا حوالہ دیتا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ کامریڈ سیمیک کو زمانہ کی تبدیلی کا مطلق احساس نہیں ہے۔ وہ اتنا بھی نہیں

سمجھنا کہ جو حقیقت کسی ایک تاریخی حالت میں صحیح ثابت ہوتی ہے کسی دوسری تاریخی حالت میں غلط ثابت ہوسکتی ہے۔ ہم نے یوگوسلاف کمیشن میں تقریر کرتے ہوئے واضح لفظوں میں کہا تھا کہ قومی مسئلہ کی نشوونما کے دو دور کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ پہلا دور انقلاب اکتوبر سے قبل کا دور تھا۔ اس وقت قومی مسئلہ سرمایہ دار جمہوری انقلاب سے وابستہ تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ مسئلہ عام جمہوری تحریک کا جزو ہے۔ اس کے بعد سے انقلاب اکتوبر کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس وقت سے یہ مسئلہ مزدور انقلاب کے مسئلہ سے وابستہ ہے اور اس وقت سے یہ مزدور انقلاب کا ایک خاص جزو بن گیا ہے۔ اس امتیاز کی ایک فیصلہ کن اہمیت ہے۔ قومی مسئلہ کی تشریح کرتے وقت کامریڈ سیمیک نے ان دونوں دور کے فرق و امتیاز کی اہمیت اور مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

مختصر یہ کہ کامریڈ سیمیک قومی مسئلہ کو ایک کسانی مسئلہ تسلیم کرنے کے بدلے مختلف قوموں کے سرمایہ داروں کی باہمی جدوجہد اور مقابلہ کا مسئلہ سمجھتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ "قومی تحریک کی اندرونی قوت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسے اس قدر کمزور سمجھتا ہے جتنی کہ وہ در اصل ہے نہیں۔ ساتھ ہی وہ قومی تحریک کی عوامی بنیاد اور انقلابی خصوصیات کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔" یہ اس کی ایک بنیادی غلطی ہے۔

ضمیمہ نمبر (۱)

قومی مسئلے پر پارٹی کی تجویز

(جو روسی سوشل ڈیموکریٹک مزدور پارٹی کی ساتویں (اپریل) آل رشین کانفرنس ۱۹۱۷ء میں منظور ہوئی تھی)

قومی جبر و تشدد کی پالیسی مطلق العنانی اور بادشاہی کے زمانے سے چلی آ رہی ہے زمیندار، سرمایہ دار اور ٹٹ پونجیہ طبقے کے لوگ اس کی حمایت کرتے ہیں تاکہ اپنے طبقاتی مراعات کی حفاظت کر سکیں اور اس کی وجہ سے مختلف قوموں کے مزدوروں میں نفاق پیدا ہو۔ جدید سامراجیت ایک نیا عنصر ہے جو کمزور قوموں کو غلام بنانے کی خواہش کو مضبوط کرتی ہے۔ اس سے قومی جبر و تشدد کی آگ اور تیز ہو جاتی ہے۔

سرمایہ داری سماج میں قومی جبر و تشدد کو اگر کسی حد تک بھی دور کیا جا سکتا ہے تو صرف ایک ایسے ڈھانچے کے اندر جو پوری طرح عمومی جمہوری ہو اور ایک ایسے نظام ریاست کے اندر جہاں تمام قوموں اور تمام زبانوں کو برابری کا درجہ دینے کی ضمانت ہو سکتی ہو۔

جو قومیں روس میں شامل ہیں ان سبھوں کا یہ حق تسلیم ہو جانا چاہیے کہ وہ آزادی سے علیحدہ ہو سکیں اور اپنی آزاد ریاستیں قائم کر سکتی ہیں۔ اس حق کو تسلیم نہ کرنا یا ان طریقوں کو اختیار نہ کرنا جن سے عملاً اس کے قابل حصول ہونے کی ضمانت ہو سکے حقیقت میں ملک گیری کی پالیسی کی حمایت کرنا ہے۔ مختلف قوموں کے مزدوروں میں مکمل اتحاد پیدا کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ مزدور طبقہ، قوموں کے حق علیحدگی کو تسلیم کرے۔ یہی چیز قوموں کو سچے جمہوری اصولوں پر ایک دوسرے کے قریب لا سکتی ہے۔

فن لینڈ اور روسی عارضی حکومت میں اس وقت جو جھگڑا اٹھ کھڑا ہو گیا ہے وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ بلا روک ٹوک علیحدہ ہونے کا حق نہ دینا زار شاہی کی پالیسی کو جاری رکھنا ہے۔

قوموں کو آزادی کے ساتھ علیحدہ ہونے کا حق ہے۔ لیکن اس حق کو اس سوال سے غلط ملط نہیں کرنا چاہیے کہ آیا کسی خاص موقع پر کسی خاص قوم کے لئے علیحدہ ہونا مناسب ہے یا نہیں۔ اس سوال کو ہر صورت میں الگ الگ مزدور طبقے کی پارٹی طے کرے گی اور اس فیصلے میں بحیثیت مجموعی پورے سماج کی نشوونما اور خاص کر اشتراکیت کے لئے مزدور طبقہ کی جدوجہد کے مفاد کا خیال رکھا جائے گا۔

چنانچہ پارٹی مطالبہ کرتی ہے کہ وسیع پیمانے پر علاقائی خودمختاری دی جائے، اوپر سے پابندیاں عائد کرنے اور ایک ہی سرکاری زبان کو ہر جگہ لازمی قرار دینے کا طریقہ مٹا دیا جائے۔ خودسر اور خودمختار علاقوں کی سرحدیں خود مقامی باشندے متعین کریں اور اس کی بنیاد معاشی اور سماجی حالتیں، اور آبادی کی قومی ساخت وغیرہ ہو۔

مزدور طبقے کی پارٹی "قومی تہذیبی خودمختاری" کے اصول کو جس کے تحت تعلیم وغیرہ ریاست کے حلقہ اختیار سے ہٹا کر قومی مجلس منتظمہ کی جیسی چیزوں کے حلقہ اختیار میں منتقل کر دی

ضمیمہ نمبر (۲)

پارٹی پروگرام سے ایک اقتباس

(یہ پروگرام روسی کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں کانگرس میں مارچ ۱۹۱۹ء میں منظور ہوا تھا)

قومی تعلقات کے باب میں

قومی مسئلے پر روسی کمیونسٹ پارٹی مندرجہ ذیل اصولوں کی روشنی میں عمل کرتی ہے۔

۱۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ مختلف قوموں کے مزدور طبقوں اور نیم مزدوروں کو ایک ساتھ لایا جائے تاکہ وہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنے کے لیے ساتھ مل کر انقلابی جدوجہد کر سکیں۔

۲۔ مظلوم قوموں کے محنت کش عوام ان ریاستوں کے مزدور طبقے کو جو ان پر ظلم کرتی تھیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس بے اعتمادی کو دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس قوم کو بھی خاص حقوق اور مراعات حاصل ہوں وہ مٹا دیے جائیں، تمام قوموں کو بالکل مساوی اور یکساں حقوق عطا کیے جائیں، اور محکوم اور غیر خودمختار قوموں کا حق علیحدگی تسلیم کیا جائے۔

۳۔ اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے پارٹی تجویز کرتی ہے کہ مکمل اتحاد کی منزل کی طرف

جانے کی نفی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ قومی تہذیبی خودمختاری کا اصول ایسے مزدوروں کو بھی جو ایک جگہ رہتے اور ایک ہی صنعتی کارخانے میں کام کرتے ہیں انتہائی مصنوعی طریقے سے اور محض اس بنا پر الگ کر دیتا ہے کہ ان کی "قومی تہذیب" مختلف ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اصول ہر قوم کی سرمایہ دار تہذیب کے ساتھ مزدوروں کے رشتے کو اور مضبوط کر دیتا ہے حالانکہ سوشل ڈیموکریسی کا مقصد دنیا بھر کے مزدوروں کی بین الاقوامی تہذیب کو مضبوط کرنا ہے۔

پارٹی کا مطالبہ ہے کہ دستور اساسی میں ایک بنیادی قانون ایسا بھی ہونا چاہیے جس کی رو سے تمام قوموں کے ناجائز مراعات مٹا دیے جائیں گے اور قومی اقلیتوں کے ساتھ جو حق تلفی کی گئی ہے اس کا انسداد کر دیا جائے گا۔

مزدور طبقے کے مفاد کا تقاضا ہے کہ روس کی تمام قوموں کے مزدور، مزدور طبقے کی مشترکہ سیاسی تنظیموں، مزدور سبھاؤں، انجمن امداد باہمی اور تہذیبی انجمنوں وغیرہ میں متحد ہو جائیں۔ مختلف قوموں کے مزدور جب اسی طرح کی مشترکہ تنظیموں کے اندر متحد ہو جائیں گے تبھی ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوگی کہ بین الاقوامی سرمایہ اور سرمایہ دار قومیت کے خلاف کامیابی سے جدوجہد کر سکیں۔

ضمیمہ نمبر (۲)

پارٹی پروگرام سے ایک اقتباس

(یہ پروگرام روسی کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں کانگریس میں مارچ ۱۹۱۹ء میں منظور ہوا تھا)

قومی تعلقات کے باب میں

قومی مسئلے پر روسی کمیونسٹ پارٹی مندرجہ ذیل اصولوں کی روشنی میں عمل کرتی ہے:۔

۱۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ مختلف قوموں کے مزدور طبقوں اور نیم مزدوروں کو ایک ساتھ لایا جائے تاکہ وہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کرنے کے لئے ساتھ مل کر انقلابی جدوجہد کر سکیں۔

۲۔ مظلوم قوموں کے محنت کش عوام ان ریاستوں کے مزدور طبقے کو جو ان پر ظلم کرتی تھیں شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس بے اعتمادی کو دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس قوم کو بھی خاص حقوق اور مراعات حاصل ہوں وہ مٹا دیئے جائیں، تمام قوموں کو بالکل مساوی اور یکساں حقوق عطا کئے جائیں، اور محکوم اور غیر خودمختار قوموں کا حق علیحدگی تسلیم کیا جائے۔

۳۔ اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے پارٹی تجویز کرتی ہے کہ مکمل اتحاد کی منزل کی طرف بڑھنے میں درمیانی مدت کے لئے سویت طرز کی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے۔

۴۔ اس سوال پر کہ علیحدگی کے لئے کسی قوم کی خواہش کا اظہار کون کرے گا روسی کمیونسٹ پارٹی، تاریخی طبقاتی نقطۂ نظر سے غور کرتی ہے۔ اور اس بات کو مدنظر رکھتی ہے کہ وہ قوم تاریخی ارتقا کی کس منزل پر ہے۔ آیا وہ ازمنہ وسطیٰ کی حالتوں سے نکل کر سرمایہ دارانہ جمہوریت کی طرف بڑھ رہی ہے یا سرمایہ دارانہ جمہوریت سے سویتی یا مزدور جمہوریت کی طرف۔

بہر صورت، جو قومیں ظلم کرتی رہی ہیں ان قوموں کے مزدور طبقے کو سخت احتیاط سے کام لینا ہوگا اور مظلوم یا غیر خودمختار قوموں کے اندر قوم پرستی کے جو بچے کھچے احساسات رہ گئے ہوں ان کو ہمیشہ دھیان میں رکھنا ہوگا۔ یہی ایک پالیسی ہے جس پر عمل کر کے ایسے حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں جن میں بین الاقوامی مزدور طبقے کے مختلف قومی عناصر میں پائیدار اور رضاکارانہ اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے۔ سویت روس کے ساتھ متعدد قومی سویتی جمہوریتوں کے اتحاد سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

پرنٹر و پبلشر محمود ... ۴۲۳ ... سے شرف علی نے چھپا کر پیپلز پبلشنگ ہاؤس راج بھون سینڈہرسٹ روڈ بمبئی ۴ سے شائع کیا